لذتِ سوزِ جگر

مولوی خواجہ معین الدین خان درویش کوٹلوی

مرتبین

حماد خان بن درویشی / اہن شاکرہ بنت درویشی

لذتِ سوزِ جگر

مولوی خواجہ معین الدین خاں درویش کورٹلوی

مرتبین

حماد خان بن درویش / امین شاگرد بنت درویش

جملہ حقوق محفوظ

نام کتاب	:	لذّتِ سوزِ جگر
مصنف	:	مولوی خواجہ معین الدین خاں درویشؔ کورٹلوی
مرتبین	:	حماد خان بن درویشی / امین شاکرہ بنت درویشی
معاون	:	اسدؔ ثنائی
سال اشاعت	:	۲۰۰۵ء مطابق ۱۴۲۶ھ
تعداد اشاعت	:	۵۰۰
کمپوزنگ	:	ممتاز کمپیوٹرس، 20-3-866 رحیم منزل، شاہ گنج، حیدرآباد۔2
		فون: 24577739,9848615340,9849341686
سرورق	:	سلامؔ خوشنویس
طباعت	:	Magnam فون: 9393377770
قیمت	:	100/روپے

ملنے کے پتے :

۱۔ مکان نمبر 19-2-621، دودھ باؤلی، پوسٹ بہادر پورہ حیدرآباد۔
فون: 24515115, 9849966128

۲۔ جواد خان/سجاد خان اولڈ کلب روڈ، کھمم۔
فون: 08742-239751

LAZZAT-E-SOUZ-E-JIGAR

BY

Molvi Khaja Moinuddin Khan Durvesh Koratlavi

PRICE ***RS.*** **100/-**

Published by

Hammad Khan

H.No. 19-2-621, Doodh Bowli,
Post Bahadurpura, HYDERABAD.

انتساب

والدہ ماجدہ

محترمہ آمنہ بیگم

زوجہ

حضرت درویشؔ کورٹلوی مرحوم

کے نام

حماد خان بن درویشی

ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری

تقریظ

۱۹۰۵ء میں از سرِ نو ضلع بندی ہوئی' اُس وقت ضلع ایلگندل کے بجائے ضلع کریم نگر وجود میں آیا۔ اضلاع تلنگانہ میں کریم نگر ضلع نہایت اہمیت کا حامل رہا ہے۔ یہاں کے سونے چاندی کے تار کے کام کو عالمی شہرت حاصل ہوئی ہے اور ضلع کریم نگر کی دوسری مشہور صنعت دستی کاغذ کی تیاری ہے۔ ضلع کریم نگر کا ایک مشہور قصبہ ''کورٹلہ'' جو کریم نگر تا نظام آباد روڈ پر بالکل درمیان میں واقع ہے' یہاں بیسویں صدی عیسوی کے ابتدائی نصف حصے میں دستی کاغذ تیار ہوتا تھا۔

قصبۂ کورٹلہ کی ایک اور اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ اُردو اور تلگو کی کئی علمی و ادبی شخصیتوں کا تعلق اسی سرزمین سے رہا ہے۔ جناب خواجہ معین الدین خاں درویشؔ کورٹلوی بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔ جناب درویش کورٹلوی ۱۹/اپریل ۱۹۲۳ء کو بمقام کورٹلہ پیدا ہوئے۔ ان کے والد داؤد علی خاں صاحب مرحوم محکمۂ جنگلات سے وابستہ تھے اور دادا جناب بلدار خاں صاحب مرحوم فوج سے منسلک تھے۔ جناب خواجہ معین الدین خاں کی تحتانوی تعلیم کورٹلہ میں ہوئی اور چادرگھاٹ ہائی اسکول حیدرآباد سے ایف۔ اے کی تعلیم مکمل کی' بعد تکمیل تعلیم ۱۹۴۸ء میں ہائی اسکول گوشہ محل' حیدرآباد میں ٹیچر مقرر ہوئے۔ گورنمنٹ ہائی اسکول سُوریاپیٹ ضلع نلگنڈہ میں دو سال خدمت انجام دینے کے بعد ۱۹۵۳ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول کھمم پر تبادلہ عمل میں آیا۔ اسی زمانے میں انھوں نے کھمم کو اپنا وطنِ ثانی بنالیا اور یہیں کے ہو رہے۔ ۱۹۵۴ء میں جماعتِ اسلامی کے رُکن ہونے کے الزام میں معطّلی عمل میں آئی' پھر ۱۹۵۵ء میں گورنمنٹ ہائی اسکول لیس جی بی ٹی بیسک ٹریننگ کھمم کے ٹیچر کی حیثیت سے بحال ہوئے۔ ۱۹۶۴ء میں جونیئر کالج ونپرتی ضلع محبوب نگر میں ایک سال خدمت انجام

دینے کے بعد ۱۹۶۵ء میں پھر کھمم تبادلہ عمل میں آیا۔ ۱۹۸۱ء میں بہ حیثیت اسسٹنٹ ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آفیسر کھمم وظیفۂ حُسنِ خدمت پر سبکدوش ہوئے۔ جناب خواجہ معین الدین خاں صاحب اپنے دور کے والی بال کے مشہور کھلاڑی رہ چکے ہیں۔ انھوں نے بہ حیثیت کیپٹن والی بال ایسوسی ایشن ٹیچرز ڈسٹرکٹ کھمم آل انڈیا ٹور کیا' دہلی' بنارس' کلکتہ' گجرات اور جموں و کشمیر ان کے ٹر میں شامل رہے۔ نجّاری' دستکاری اور جلد سازی میں بھی انھوں نے کافی مہارت حاصل کی تھی۔

جناب خواجہ معین الدین خاں درویش کورٹلوی نے اپنی علمی و ادبی صلاحیتوں' سماجی اور دینی خدمات کے ذریعے اہلیان ضلع کھمم کے دلوں میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا تھا' وہ اپنے دوست احباب میں نہایت ہردلعزیز رہے ہیں' بالخصوص مولانا عبدالعزیز نائب امیر جماعت اسلامی ہند' مولانا عبدالرزاق لطیفی مرحوم سابق امیر جماعت اسلامی آندھرا پردیش' مولانا عبدالعزیز عالم سوریاپیٹ' جناب اسداللہ سعید سابق کلکٹر ضلع کھمم' جناب امجد علی خاں سابق کلکٹر ضلع کھمم' جناب محمد خواجہ سابق کلکٹر ضلع کھمم' جناب سید داؤد حسینی سابق ڈی۔ او کھمم' محترمہ شاہ جہاں بیگم سابق ڈی۔ ای۔ او کھمم' ڈاکٹر ایس۔ اے مجید' جناب سکندر محسن' جناب شیخ احمد ٹیچر' جناب ایچ۔ وی۔ شرما ٹیچر' جناب فقیر محمد موسیٰ تاجر' جناب عبدالرحمٰن محمد موسیٰ تاجر' جناب سیتا رامیا' جناب عبدالکریم تاجر' جناب سید عباس تاجر' انقلابی شاعر کامریڈ مخدوم محی الدین' دکھنی شاعر جناب غلام سرور ڈنڈا' مزاحیہ شاعر جناب گلی نلگنڈوی' مقامی شاعر جناب ہیرالال موریا اور مشہور غزل گائیک جناب وٹھل راؤ وغیرہ سے جناب درویش کورٹلوی کے نہایت قریبی روابط اور تعلقات رہے ہیں۔ یکم نومبر ۲۰۰۲ء کو مستقر کھمم پر منعقدہ مشاعرے کی صدارت کی۔ ان کا یہ آخری مشاعرہ تھا' جس میں انھوں نے بہ حیثیت صدر مشاعرہ اپنا کلام پیش کیا تھا۔ ۲۱ رفبروری ۲۰۰۳ء کو بمقام مستقر کھمم داعیٔ اجل کو لبیک کہا اور اپنے مالکِ حقیقی سے جا ملے۔ ان کے پسماندگی میں بیوہ' تین لڑکے اور تین لڑکیاں شامل ہیں۔

جناب خواجہ معین الدین خاں درویش کورٹلوی نے قرآن و احادیث' فقہی و شرعی

رسائل و مسائل اور مسلم پرسنل لا کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور ان پر عبور حاصل کیا۔ یہی وجہ تھی کہ مسلمانانِ ضلع کھمم ان کی رائے سے استفادہ کرتے تھے اور دیگر دینی اور دُنیاوی معاملات میں ان سے مشورے حاصل کیا کرتے تھے۔ جناب درویشؔ کورٹلوی نے نہ صرف دینی کتب کا مطالعہ کیا تھا، بلکہ بائیبل، بھگوت گیتا اور دوسرے مذاہب کی اہم کتابیں بھی ان کے زیرِ مطالعہ رہیں۔

جناب خواجہ معین الدین خاں درویشؔ کورٹلوی میرے ممیرے بھائی ہیں۔ اُنھوں نے درویش اور درویشیؔ دونوں تخلص استعمال کئے ہیں۔

کہا جاتا ہے کہ وہی شخص شاعر ہوسکتا ہے، جس میں جمالیاتی اور شعری ذوق بدرجۂ اتم موجود ہو۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لازمی ہے کہ اُس شخص کا شعری ذوق انتہائی سلجھا ہوا، نکھرا ہوا، مہذب، وقیع اور جلا پایا ہوا ہو۔ یہ بات بھی حقیقت پر مبنی ہے کہ شعر و شاعری کے ذریعے بگڑے ہوئے معاشرے کو نہ صرف دُرست کیا جاسکتا ہے بلکہ اُس کو از سرِ نو سنوارا اور سجایا بھی جاسکتا ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اشعار میں اعلیٰ اخلاقی اقدار اور پند و نصیحت کی باتیں شامل ہوں، جو زندگی کے لئے مشعلِ راہ ثابت ہوں۔ یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ شائستہ، ادبی، اصلاحی، انقلابی اور اعلیٰ معیاری اشعار سے لوگوں کے ذہنوں میں انقلاب برپا ہوتے ہیں۔ یہ بات بھی مسلمہ ہے کہ ہر اچھا شعر لوگوں کے ذہن پر اثر انداز ہوتا ہے اور اچھا شعر وہی ہے، جس میں اعلیٰ و ارفع خیالات ہوں، شعر شعریت سے عاری نہ ہو بلکہ غنائیت لئے ہوئے ہو اور الفاظ کی نشست مناسب اور موزوں ہو۔

جناب درویشؔ کورٹلوی کے کلام میں مندرجہ بالا سبھی خصوصیات موجود ہیں۔ ان کے کلام میں مقصدیت ہے، ایک سمت ہے، گہرائی و گیرائی ہے، روانی اور صحتِ زبان کا التزام بھی ہے اور ان کا کلام داخلیت اور خارجیت کا سنگم ہے۔

دھندلکے شب کے رخصت ہو رہے ہیں — سحر ہونے میں ہے کچھ دیر باقی
طلوعِ شب سے ہوں محرومِ بارہ — یہ کیا اندھیر ہے اندھیر ساقی
تجربہ شاہد ہے درویشیؔ بساطِ شعر میں — ''لذتِ سوزِ جگر'' سے لطفِ اعجازِ سخن

مری آہوں میں شعلوں کا اثر ہے
مرا سوزِ دروں پوشیدہ تر ہے

مجھے تاکید ضبط غم نہ کیجیے
دل اس دیوانگی سے باخبر ہے

میں اُس کو ڈھونڈنے نکلا ہوں لیکن
نہ جادو ہے نہ کوئی رہ گزر ہے

بقدرِ ظرف ملتا ہے ہراک کو
یہ پیمانہ ہے جامِ جم نہیں ہے

وجود میں اب بھی ہے باقی آدمی کا
وہ رُوحِ عظمتِ آدم نہیں ہے

تاریکیوں میں شمع جلانا ہے میرا کام
شاعر ہوں مرا امن سے رشتہ ہے سُن ذرا

کلی کا حسن ہوئے پھول کا شباب ہوئے
وہ جلوے جو تری نظروں سے فیضیاب ہوئے

صلیبیں لاکھ لٹکتی رہیں سروں پہ مگر
یہ اہلِ حق نہ رکیں گے قدم بڑھانے سے

میں قطرہ ہوں سمندر پی گیا ہوں
ابھی ہے تشنگی آہستہ بولو

نقوشِ غم اگر پڑھنا ہو لوحِ دل کو پڑھ لینا
کسی کتبہ کی طرح رُخ پہ وہ کندہ نہیں ہوتے

جانے کیا انجام ہو اس جرأت بیباک کا
حدِّ امکاں سے بھی آگے ہے نگاہِ فکر وفن

خدا رکھے سلامت میرے غم کو
مجھے اب اور کوئی غم نہیں ہے

مرے وجدان کی قیمت ہے یہی درویشی
مجھ کو جو بات بھی کہنی ہو سلیقہ سے کہوں

درویش کورٹلوی نے غزلوں کے علاوہ بڑی خوبصورت نظمیں بھی کہیں ہیں۔

نظم مرے عزیز وطن میں کہتے ہیں ؎

تری بقا میں ہے پوشیدہ زندگی اپنی
ترا وجود ہے گویا سلامتی اپنی
ترے وقار سے وابستہ ہے خوشی اپنی
یہ فرض تیرے لئے اختیار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

عظیم مجاہد آزادی اور ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو کی وفات پر خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتے ہیں ؎

کچھ اور روز وطن کو تیری ضرورت تھی
جو تو نہیں ہے اسی ایک بات کا غم ہے
مورخین اٹھائیں گے جب قلم درویشؔ
یہی لکھیں گے جواہر تو فخرِ عالم ہے

۱۹۵۲ء میں ان کی پہلی نظم شائع ہوئی اور ۱۹۶۶ء میں آل انڈیا ریڈیو پر انھوں نے کلام پیش کیا۔

افرادِ خاندان کی اطلاعات کے بموجب جناب درویشؔ کورٹلوی کا کلام کئی صفحات پر مشتمل ہے، خود انھوں نے چھ سات قلمی بیاضیں تیار کی تھیں اور چیدہ چیدہ اوراق پر بھی ان کا کلام بکھرا ہوا ہے۔ فی الحال ان کی ایک قلمی بیاض کے کلام کو ''لذتِ سوزِ جگر'' کے نام سے شائع کیا جا رہا ہے۔

اس مجموعۂ کلام میں ایک نعت بہ عنوان ''نذرانۂ عقیدت بحضور سرورِ کونین رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم''، غزلیں، نظمیں ٹیگور، نہرو، میرے عزیز وطن، گم نام درخواست، شراب کی تباہی، قطعات اور مثلث کے علاوہ ''خودکشی'' کے عنوان سے ایک آزاد نظم شامل ہے۔

یہ بات نہایت مسرت وانبساط کی ہے کہ جناب خواجہ معین الدین خان درویشؔ کورٹلوی کے بڑے فرزند جناب حماد خان صاحب نے اپنے والد کے کلام کو شائع کرنے کا عزم کیا اور ''لذتِ سوزِ جگر'' کے نام سے مجموعۂ کلام کو زیورِ طباعت سے آراستہ کر کے اس بات کا ثبوت پیش کیا ہے کہ وہ اپنے والدِ محترم سے بے انتہا خلوص ومحبت رکھتے ہیں۔

❖ ❖ ❖

سردار سلیم

درویش کورٹلوی کا شعری اسلوب

ادب ہمیشہ تغیر پذیر رہتا ہے اس کا جیتا جاگتا ثبوت ترسیل وتشکیل کا وہ نیا تصور ہے جسے مابعد جدیدیت کہا جاتا ہے۔ اگر اسے روایتوں کی بازیافت مان لیا جائے تو آج کا کلاسیکی ادب تخلیق کرنے والا ہر فنکار مابعد جدید ادب کا نمائندہ ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے' تب بھی روایتی شعر وادب کی اپنی اہمیت وشناخت ہے۔ روایتی شاعری کا بنیادی وصف وہ رومانی فضاء ہے جو تخلیق کار کی شعوری رو سے جڑی رہتی ہے' غم جاناں کا حقیقی سوز وگداز قدیم شاعری ہی نے جنم دیا ہے اور اسی کے بطن سے تصوف کی شعاعیں پھوٹیں' گو کہ معاصر کلاسیکی شاعروں کے پاس وہ سلیس' شستہ' بامحاورہ اور دلکش زبان شاذ ونادر ہی نظر آتی ہے۔ مگر غنیمت ہے کہ کچھ زبانوں پر نغز کی شیرینی فنی رچاؤ کے ہمراہ زندہ ہے۔ درویش کورٹلوی مرحوم جو حیدرآباد کے ایک دور افتادہ مقام سے تعلق رکھتے ہیں لیکن انھوں نے اپنے لہجے کو ٹکسال باہر نہیں ہونے دیا۔ بیشتر شعراء کا لہجہ کسی نہ کسی زاویے سے ان کے مقام کی نشاندہی کر دیتا ہے۔ مگر کامیاب شاعر وہی ہے جس کا لب ولہجہ کسی مخصوص علاقے کی پہچان نہ ہو اور معیاری تخلیق وہی ہے جس کا صوتی حسن ذہنی وارضی فاصلوں سے ممتاز ہو۔ درویش کورٹلوی کی شاعری فن کی اس نہج پر نظر آتی ہے جہاں زمینی اثرات دخل اندازی کی جرأت نہیں کر سکتے۔ بعض تسامحات سے صرف نظر کرتے ہوئے اگر ان کی شاعری کے محاسن پر گفتگو کی جائے تو بلاشبہ ہر لفظ کے آہنگ سے کئی روشن اور خوبصورت پہلو ابھر آئیں گے۔ لیکن یہاں شاعر کی تعریف کا مفہوم ستائش نہیں بلکہ تعارف ہے۔ تعارف کسی گمنام شخصیت پر روشنی ڈالنے کا نام نہیں ہے جس طرح پڑھی ہوئی کہانیاں بار بار پڑھنے سے حفظ ہو جاتی ہیں اسی طرح تعارف بجھتے

ہوئے چراغوں میں تیل کا کام کرتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ بعض شہرہ آفاق ہستیوں کا تعارف اور سوانح وغیرہ بار بار دہرائے جاتے ہیں۔ سچ پوچھئے تو ماہرین ادب غالبؔ کا مکمل تعارف حاصل کرنے کی جدوجہد میں آج تک لگے ہوئے ہیں تو جس دنیا میں غالبؔ کا تعارف ادھورا ہو وہاں درویشؔ کورٹلوی کا تعارف ادھورا رہ جائے تو حیرت نہیں۔ بہرحال مسرت کی بات یہ ہے کہ آج مختلف النوع رجحانات کی چکا چوند میں خالص ادب کہیں دب کر رہ گیا ہے۔ اُردو معاشرے کو اب بھی اچھے ادب کی ضرورت ہے۔ اور ''اچھا ادب'' روایتی' ترقی پسند' جدید یا مابعد جدید کے مباحث سے بے تعلق رہ کر تخلیق پاتا ہے اور یہی ادب ہے جو زیادہ عرصے تک زندہ رہتا ہے۔ ورنہ ہمارے پاس شاعری کی کمی نہیں ہے۔ درویشؔ کورٹلوی کو زبان و بیان پر دسترس حاصل ہے۔ ان کی تخلیقات کا موضوعاتی نظام' سعیٔ پیہم' جذبۂ بیدار' عشق صادق اور دردمندی کے عناصر سے مزین ہے۔ اشعار میں ان کی آواز کہیں فرط جوش سے بلند ہو جاتی ہے تو کہیں متانت کا لبادہ اوڑھ کر دب جاتی ہے۔ کتاب میں غزلیں' قطعات اور نظمیں شامل ہیں۔ کچھ منتخب شعر درج کر رہا ہوں ملاحظہ ہو ؎

آدمی وہ ہے کہ دنیا میں جسے — آدمی کے کام آنا آ گیا
تری جب بھی کمی محسوس کی ہے — یہ دنیا اجنبی محسوس کی ہے
لذت غم سے نہیں ایک زمانہ واقف — ہم جسے گردش پیمانۂ دل کہتے ہیں

وفا کے سنگین مرحلوں میں جو بار ہستی اٹھا سکیں گے
مجھے یقیں ہے انھیں زمانے کے سارے غم راس آ سکیں گے

ذوق منزل اسے راس آ ہی گیا — رہنما راہ کے پیچ و خم ہو گئے
تشبیہ کا افسوں ہے کہ اعجاز ہنر ہے — گیسو سے ترے جو سحر و شام تراشے
بہ خوبی علم ہے حالات کو میرے تحمل کا — حوادث پئے بہ پئے آنے کی گنجائش بہت کم ہے
میں اک احساس ہوں میرے جذبات لکھ — اے نقیب قلم میری ہر بات لکھ

❖ ❖ ❖

نذرانۂ عقیدت

بہ حضور کونین رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم

سکونِ دل قرارِ جانِ مضطر لالۂ صحرا
دو عالم کا ہے جو ہادی و رہبر لالۂ صحرا

وقارِ زینت محراب و منبر لالۂ صحرا
سراپا نورِ ایماں کا ہے پیکر لالۂ صحرا

کیا اہل چمن پر راز افشاں تو نے شبنم کا
تو ہے خوشبو میں مثلِ مشکِ ازفر لالۂ صحرا

سمٹ کر آ گئیں رنگینیاں سارے گلستاں کی
ہجوم گل میں ہے یکتا و بہتر لالۂ صحرا

دلوں کو نعرۂ تکبیر سے گرمادیا تونے
نقیب لاالٰہ اللہ اکبر لالۂ صحرا

وہی خوشبو ابھی تک سارے عالم میں مہکتی ہے
کیا تھا خاکِ بطحیٰ کو معطر لالۂ صحرا

فرشتے کہہ اٹھیں نعتِ نبی سن کر یہ درویشؔ
وجودِ آدم خاکی کا مظہر لالۂ صحرا

قفل درِ میخانہ کھلا تیری طلب میں
میخوار ہر اک جھوم اٹھا تیری طلب میں
ہم راہ پہ باصدق و وفا تیری طلب میں

چلتے رہے ہم آبلہ پا تیری طلب میں
ہم بھول گئے عرضِ جفا تیری طلب میں
اتنا تو ہمیں پاس رہا تیری طلب میں

ϖ ϖ ϖ

غزلیں

جب تک نہ ہو شائستۂ آدابِ جنوں دل
درویشؔ نہ آئیگا کبھی رنگ تغزل

کچھ نقشِ حسیں صورت ابہام تراشے
اچھا سا مگر اسکا کوئی نام تراشے

تشبیہ کا افسوں ہے کہ اعجازِ ہنر ہے
گیسو سے جو تیرے سحر و شام تراشے

دیکھا جو کنائے نے ترے خندۂ لب کو
سو طرح کے خورشید لبِ بام تراشے

قامت ہی قیامت ہے تو یہ طرفہ ستم کیا
شانوں پہ جو یوں زلفِ سیہ فام تراشے

اک شاہد معصوم کو ارباب ہوس نے
مقصود بنایا کبھی الزام تراشے

رسوا سرِ بازار کیا جوشِ وفا کو
دامن پہ غریب عشق کے دشنام تراشے

ٹوٹے ہوئے دل جتنے تھے مٹی میں ملا کر
ساقی نے خمِ گردش ایام تراشے

ہے مجھ پہ عبث تہمت تحریک محبت
خود تیری نگاہوں نے تھے پیغام تراشے

سب ڈھیر ہوئے عظمتِ جمہور کے آگے
ماضی نے جو شاہی کے در و بام تراشے

اب مانی و بہزاد کی حاجت نہیں درویشؔ
خود میرے فنِ شعر نے ابہام تراشے

وہ ترا انداز شوخی وہ نرالا بانکپن
تھرتھرائے گل پہ جیسے صبح کی پہلی کرن

دیدنی ہوتا ہے منظر اور بھی کچھ حسن کا
زیرِ لب ہوتا ہے جب ان کے تبسم موجزن

فکر کی ڈھونڈا نہ پایا کوئی عنوانِ غزل
یاد کیوں آئی نہ جانے تیرے گیسو کی شکن

جانے کیا انجام ہو اس جرأت بیباک کا
حدِّ امکاں سے بھی آگے ہے نگاہِ فکر و فن

کس قدر دشوار میں راہِ طلب کے مرحلے
پوچھئے اہل وفا سے عظمت دار و رسن

ہو چلا ہوں بے نیازِ دید تیرے عشق میں
بعد مدت رنگ لایا ہے مرا دیوانہ پن

تجربہ شاہد ہے درویشیؔ بساطِ شعر میں
لذتِ سوزِ جگر سے لطف اعجازِ سخن

عشق میں سوز و جلن ہو تو غزل ہوتی ہے
اپنے مقصد سے لگن ہو تو غزل ہوتی ہے

وسعتِ کوہ و دمن پر ہے خموشی طاری
نغمۂ مرغِ چمن ہو تو غزل ہوتی ہے

شفقِ شام کہیں اور کہیں نور سحر
فطرتِ حسن مگن ہو تو غزل ہوتی ہے

قلبِ شاعر کے لئے ایک مصوّر کی طرح
سامنے غنچہ دہن ہو تو غزل ہوتی ہے

میرا اندازِ جنوں اور میری فکر و نظر
واقفِ رنج و محن ہو تو غزل ہوتی ہے

کاروانِ سمن و سنبل و ریحاں میں اگر
آتشِ گل کی پھبن ہو تو غزل ہوتی ہے

نرگس نیم شگفتہ پر نظر ہے لیکن
چشمِ آہوئے ختن ہو تو غزل ہوتی ہے

طبع موزوں ہی نہیں پیش نظر درویشیؔ
کوئی موضوعِ سخن ہو تو غزل ہوتی ہے

ساجدہ کی موت پر

مری آہوں میں شعلوں کا اثر ہے
مرا سوزِ دروں پوشیدہ تر ہے

جہانِ رنگ و بو پیشِ نظر ہے
یہ سب ترا ہی حسنِ کار گر ہے

مجھے تاکیدِ ضبطِ غم نہ کیجئے
دِل اس دیوانگی سے باخبر ہے

یہ کیسی بے خودی طاری ہے مجھ پر
گریباں کی نہ دامن کی خبر ہے

میں اس کو ڈھونڈنے نکلا ہوں لیکن
نہ جادہ ہے نہ کوئی رہ گذر ہے

اب اس منزل پر آخر آ گیا ہوں
جبیں میری ہے تیرا سنگِ در ہے

دِل درویشؔ میں باقی ہے اب تک
تیرا غم جس قدر ہے معتبر ہے

راز ہستی کی غمِ دل کو خبر کرتے ہیں
ہم بھی اک مشغلۂ شام و سحر کرتے ہیں

ہم سمجھتے ہیں کہ خطرہ ہے نشیمن کو مگر
احترام روشِ برق و شرر کرتے ہیں

ٹھوکریں کھا کے بھی پاتے ہیں سراغِ منزل
ظلمتِ شب سے نمودار سحر کرتے ہیں

ہم نے فطرت سے یہ سیکھا ہے سلیقہ جب سے
جلوۂ حسن کو پابندِ نظر کرتے ہیں

ہوش اتنا تو ہے باقی ابھی دیوانوں میں
زخم دل سہتے ہیں اور چاک جگر کرتے ہیں

ذوقِ آداب فغاں سے جو ہیں واقف وہ دل
قطرۂ اشک کو ہمرنگِ گہر کرتے ہیں

عالم یاس میں ہم سوختۂ آتشِ غم
شمع کی طرح سے رو رو کے سحر کرتے ہیں

غمِ ہستی کو بھلانے کے لئے درویشیؔ
بات کچھ بھی نہیں ہوتی ہے مگر کرتے ہیں

اگر دل آشنائے غم نہیں ہے
وہ میرے عشق کا محرم نہیں ہے

حیات و موت ہیں سب بے نتیجہ
اگر سوزِ یقیں پیہم نہیں ہے

وفا کہتے ہیں جس کو اہل دانش
وہ میرے زخم کا مرہم نہیں ہے

یہ کانٹے تولتے ہیں حسن گل کو
کرم اتنا بھی ہو تو کم نہیں ہے

بقدر ظرف ملتا ہے ہر اک کو
یہ پیمانہ ہے جامِ جم نہیں ہے

ترے احساس کا دامن ابھی تک
ہوا ہے چاک لیکن نم نہیں ہے

نظر راہی کی سنگ میل پر ہے
اصیلِ کارواں برہم نہیں ہے

تڑپنا بھی سکونِ دل ہے لیکن
تڑپنے کا بھی دل میں دم نہیں ہے

وجود اب بھی ہے باقی آدمی کا
وہ روحِ عظمت آدم نہیں ہے

جو شدت غم میں تھی باقی ہے اب تک
مگر کیوں آنکھ میری نم نہیں ہے

خدا رکھے سلامت میرے غم کو
مجھے اب اور کوئی غم نہیں ہے

یقیں کرلو چمن میں آج درویشؔ
کلی پروردۂ شبنم نہیں ہے

بات کرنی تھی بیاں کر نہ سکا
دل کو پابندِ زباں کر نہ سکا

عقل و دانش کی گذرگاہوں سے
جہدِ تسخیرِ جہاں کر نہ سکا

عظمت دیر و حرم کی خاطر
شکوۂ پیرِ مغاں کر نہ سکا

تنگ دامانی قسمت کا گلہ
تجھ سے اے عمرِ رواں کر نہ سکا

جان کر درد امانت ہے تری
منتِ چارہ گراں کر نہ سکا

میں نے ہر چیز سنواری لیکن
روحِ احساس جواں کر نہ سکا

تہمتِ عشق لی سر اپنے مگر
خدشۂ سود و زیاں کر نہ سکا

شدت غم کا مداوا کیا ہو
کبھی توہینِ فغاں کر نہ سکا

وہ تیرا زمزمہ خواں درویشی
حالِ دل تجھ سے بیاں کر نہ سکا

چاہتا ہے گر منور ہو جہاں
شمع کی مانند جلنا سیکھ لے

ہے یہی درمانِ دردِ زندگی
سوزشِ غم سے پگھلنا سیکھ لے

دیکھنا ہو حسنِ فطرت کو اگر
عشق کی حد سے نکلنا سیکھ لے

تو نہ کر تائیدِ اوہامِ کہن
اک نئے سانچے میں ڈھلنا سیکھ لے

منظر ساحل سے کچھ حاصل نہیں
مضطرب موجوں میں پلنا سیکھ لے

ہمرکابی موت کی ہرگز نہ کر
زندگی کے ساتھ چلنا سیکھ لے

منزلیں خود ہی بلائیگی تجھے
ٹھوکریں کھا کر سنبھلنا سیکھ لے

شرط یہ ہے شعرِ موزوں کے لئے
دل قرینے سے مچلنا سیکھ لے

لے کے درویشی سے درسِ آگہی
ہر تصور کو بدلنا سیکھ لے

زبانِ شوق نے جنبش جو کی بیاں کے لئے
بہانہ مل گیا اظہارِ دوستاں کے لئے

خزاں کا دور گیا فصلِ نو بہار آئی
یہ لطفِ خاص مگر صحنِ گلستاں کے لئے

روش روش پہ کیا احترام برق و شرر
یہ جان کر بھی کہ خطرہ ہے آشیاں کے لئے

عجیب کیف کا عالم ہے بے پئے ساقی
سہارا مل نہ سکا لرزشِ زباں کے لئے

جمالیات کی قدریں بدل گئیں جب سے
نسیم محوِ تجسس ہے قدرداں کے لئے

ہمارے عشق کا معیار ہی انوکھا ہے
یہ حسن ایک تماشا ہے دو جہاں کے لئے

جنوں کو آج یہ کہتے ہوئے سنا ہم نے
نگاہِ دل میں فقط اس کے امتحان کے لئے

رہِ طلب میں ذرا سی خطا یہ درویشی
بھٹک کے رہ گئے صحرا میں کارواں کے لئے

بہ فیضِ عشق روح کا سلام لے رہا ہوں میں
مگر بہ حسنِ شوق دل سے کام لے رہا ہوں میں

نہ دردِ عاشقی رہا نہ جذبِ دل نہ قدرِ دل
یہ کس مقام پر وفا کا نام لے رہا ہوں میں

نظر نظر سے لڑگئی ذرا سے اِس قصور پر
سر اپنے میکشی کا اتہام لے رہا ہوں میں

طلوعِ نورِ صبح سے چمک رہی ہے زندگی
شگفتگیٔ روحِ لالہ فام لے رہا ہوں میں

رہِ طلب میں خود سری کے کچھ تو ہونگے مرحلے
جنوں کی آنچلوں کو بڑھکے تھام لے رہا ہوں میں

ملا ہے زخمِ دل کے ساتھ مرہمِ حیات بھی
غم آشنا ہوں ضبطِ غم سے کام لے رہا ہوں میں

رخِ صبیح پر ہو جیسے زرد زرد چاندنی
افق کے آئینہ میں عکس شام لے رہا ہوں میں

سنائی سازِ دل پہ وہ غزل کے اہلِ بزم سے
سلامِ شوق و لذتِ کلام لے رہا ہوں میں

رواں رواں سوادِ شب دواں دواں بیاضِ صبح
نظارہ ہائے حسنِ ناتمام لے رہا ہوں میں

تمہیں سناؤں بھی تو کیا وہ دورِ شاعری گیا
بس اب سخن طرازیوں سے کام لے رہا ہوں میں

یہ کائنات ہی معین ہے غزل کی طرز پر
یہاں نشاط و کیف و مئے کے جام لے رہا ہوں میں

جس کو بارِ غم اٹھانا آ گیا
اُس کو بزم دِل سجانا آ گیا

آدمی وہ ہو کہ دنیا میں جسے
آدمی کے کام آنا آ گیا

زندگی کے ساز پر باطرزِ نو
عشق کے نغمے سنانا آ گیا

صحن گلشن میں خزاں کو آج کل
روحِ خوابیدہ جگانا آ گیا

میرا اجڑا آشیانہ دیکھ کر
برق کو بھی مسکرانا آ گیا

شمعِ نورِ یقیں کے فیض سے
تیرگی دل مٹانا آ گیا

اب انہیں بھی بادِلِ نا خواستہ
خون کے آنسو رلانا آ گیا

تنگ آ کر میکدوں کے جام سے
تشنگی دل بڑھانا آ گیا

بہر سجدہ آستانے پر ترے
سر سلیقے سے جھکانا آ گیا

دیکھ کر شبنم کو گل پر اشک ریز
آنسوؤں کو جھلملانا آ گیا

تیری یادوں کی سجا کر انجمن
رنگِ میخانہ جمانا آ گیا

مدتوں کے بعد درویشؔ کو آج
ظرفِ ہستی آزمانا آ گیا

گلِ آتش بدن کی بات کرو
شوخیٔ پیرہن کی بات کرو

حسنِ صحنِ چمن کی بات کرو
لالہ و نسترن کی بات کرو

چھوڑ کر داستانِ اہلِ وفا
ہم سے دار و رسن کی بات کرو

دیکھنا ہو جو گرمیٔ گفتار
ہمدمو ، ہم سخن کی بات کرو

زخم دل کہنہ ہوگئے ہیں تمام
پھر کسی خندہ زن کی بات کرو

ہو اگر ذوق آبلہ پائی
دشت و کوہ و دمن کی بات کرو

رونقِ انجمن بڑھانے کو
شمعِ انجمن کی بات کرو

غمگسار و علاجِ غم کے لئے
کوئی شیریں دہن کی بات کرو

وقت کے اب بدل گئے دھارے
نئے رسم و چلن کی بات کرو

فصلِ گل آئی بھی چلی بھی گئی
اجڑے اجڑے چمن کی بات کرو

عشق آساں نہیں ہے درویشی
جذبۂ کوہکن کی بات کرو

تری جب بھی کمی محسوس کی ہے
یہ دنیا اجنبی محسوس کی ہے

جو آنسو آنکھ سے ٹپکے ہیں پیہم
انہیں اک پھلجڑی محسوس کی ہے

دل سوزاں کی طرح تھا قمر بھی
طلوعِ شب جلی محسوس کی ہے

مرے زخمِ جگر جب مسکرائے
تو ہر سو چاندنی محسوس کی ہے

تھمے آنکھوں سے جوں ہی اشک مرے
لبوں پر تشنگی محسوس کی ہے

چٹک کر جب کلی انگڑائی لی ہو
لبِ گل پر ہنسی محسوس کی ہے

لٹا کر کائناتِ شوق میں نے
خلوصِ دلبری محسوس کی ہے

میرے قلب و نظر کی بے قراری
زوالِ آدمی محسوس کی ہے

مری حالت پہ بھی مسکرا کر
بلا کی سادگی محسوس کی ہے

یہ کس کا ہے تصوّر بے پیے بھی
سرور و بے خودی محسوس کی ہے

وفا کے روبرو آ کر ہوس نے
بڑی شرمندگی محسوس کی ہے

قدم آگے بڑھے جب جستجو کے
ہر اک منزل کڑی محسوس کی ہے

مزاجوں میں فقیہانِ حرم کے
مذاقِ آذری محسوس کی ہے

بہ فیضِ فکر درویشیِ خرد نے
شعور و آگہی محسوس کی ہے

وحشتِ عشق کا جب دل پہ اثر دیکھے ہیں
جلوۂ حسن کو تا حدِنظر دیکھے ہیں

خود مرے ذوقِ نظر کو ہے تعجب ابتک
شب کی آغوش میں انوارِ سحر دیکھے ہیں

میں نے غنچوں کے چٹکنے کی صدائیں ہیں سنیں
چاک ہوتے ہوئے پھولوں کے جگر دیکھے ہیں

یوں تو قائل ہوں صدف کے بھی مقدر کا مگر
کبھی ڈھلتے ہوئے آنکھوں سے گہر دیکھے ہیں

غمِ انساں ، غمِ دوراں ، غمِ بربادیٔ دل
میں نے کیا کیا یہ مقاماتِ بشر دیکھے ہیں

دیدہ و دل ہیں بظاہر مرے سادہ لیکن
رقص کرتے ہوئے کچھ ان میں شرر دیکھے ہیں

اک زمانہ تھا کہ بجلی سے سہم جاتے تھے
دامنِ برق میں پلتا ہوا گھر دیکھے ہیں

شوق نے تجھکو بہ ہرگام پکارا لیکن
ختم ہوتی نہ تری راہگذر دیکھے ہیں

لے کے سینے میں حضوری کی تڑپ درویشی
قلب و احساس کو بادیدۂ تر دیکھے ہیں

دیدۂ نم میں آب رہنے دے
ذوقِ غم لاجواب رہنے دے

ابھی عمرِ رواں ہے گرمِ سفر
گردشِ آفتاب رہنے دے

جسقدر ہیں حقائق روشن
تو انہیں بے نقاب رہنے دے

الجھا الجھا ہوا ہے نظمِ حیات
زلف کے پیچ و تاب رہنے دے

جذبہ ہائے دروں کی صورت میں
دل کو بااضطراب رہنے دے

تری نظریں ہیں میکدہ بردوش
رقصِ جام شراب رہنے دے

میری بربادیوں کے افسانے
دلِ خانہ خراب رہنے دے

اور کچھ روز ان حسینوں کو
روکشِ ماہتاب رہنے دے

کر نہ ذکرِ مآل حسنِ چمن
گل کے رخ پر شباب رہنے دے

غم دنیا کے ساتھ درویشی
غمِ روزِ حیات رہنے دے

کبھی تو حسن کے کچھ گل کھلائے تو سہی
نگاہِ دیدہ و دل آزمائیے تو سہی

نیازِ عشق کے آگے اے ساکنانِ چمن
حدیثِ ذوق تمنّا سنائیے تو سہی

خیال کیجئے ساحل سے جانب طوفاں
سفینہ ڈوب رہا ہے بچائیے تو سہی

یہی بنائے سزا تھی لیا تھا نام ان کا
پہنچ کے دار پہ بھی مسکرائیے تو سہی

غمِ حیات کی ان تیرہ رہگذاروں میں
شعاعِ رشکِ قمر بنکے آیئے تو سہی

کلام آپ کا نکھرے گا اور درویشی
جنون کو فکر کا محور بنائیے تو سہی

یہ جانِ جہاں جانِ وفا جانِ غزل ہے
تقدیسِ محبت کا نشاں تاج محل ہے

اک جلوۂ مہتاب میرے پیش نظر ہے
جس طرح ابھرتا کوئی موجوں سے کنول ہے

پروانے کے جلنے ہی پہ موقوف نہیں ہے
جلتی ہوئی ہر شمع بھی مانوس اجل ہے

فطرت کے حسیں ذوق پہ رکھتا ہوں نظر میں
یہ ذوق ہی دراصل مری جانِ غزل ہے

پلکوں پہ امڈتا ہوا اشکوں کا تلاطم
محسوس یہ ہوتا ہے کوئی شیش محل ہے

میخاروں کو اک بوندھ کبھی مل نہ سکے گی
جس ساقی میخانہ کی نیت میں خلل ہے

شب بھر میری آنکھوں سے برستی رہی شبنم
شاید یہ کسی درد کے احساس کا پھل ہے

بیداریٔ افکار پہ نازاں ہے خرد آج
ہنسنے کا نہیں صرف تبسم کا محل ہے

ہے فکرِ رسا وسعتِ کونین پہ چھائی
درویشؔ میرے ہاتھ میں دامانِ غزل ہے

یارانِ گلستاں سے کہدو تکلیفِ توجہ فرمائیں
پھر فصلِ بہاراں آئی ہے دامن کو گلوں سے بھرلائیں

کچھ جذبۂ دل بھی رکھتے ہیں کچھ ذوق نظارہ بھی ہے مگر
گلشن کی طلب آسان نہیں یہ بات جہاں کو سمجھائیں

اخلاص کے بارِ احساں سے اب چشمِ عدو بھی ہے حیراں
اس بوئے وفا کو گلشن میں دامن کی ہوا سے مہکائیں

میخانہ سلامت ہے جب تک یہ بات کوئی مشکل تو نہیں
کہئے کہ جنابِ ساقی سے رندوں پہ عنایت فرمائیں

ساحل پہ رہے جو مدت تک طوفاں سے ہو کر بیگانہ
موجوں تک ان اہلِ کشتی کو آؤ تو ذرا پہنچا آئیں

نغمات بہارِ آزادی جمہور کی محنت کا پھل ہے
مرغانِ خوش الحاں سے کہدو دل سوز ترنم میں گائیں

یہ ماہ و سال کی بات نہیں درویشؔ نے عمر گذاری ہے
جینے کا سلیقہ تب آیا اپنوں سے کہو نہ گھبرائیں

خلاف دستور کیوں خزاں میں بہار گلشن پہ مہرباں ہے
چمن پرستوں کے دل میں شاید ابھی مذاقِ سفر جواں ہے

ہمارے نقشِ قدم سے اک ایک رہگذر جگمگا اٹھے گی
زہے مقدر دلوں میں ابتک چراغِ امید ضوفشاں ہے

لبوں پہ موہوم سا تبسم نگاہ بھی ہے جھکی جھکی سی
مگر ذرا سوچ کر بتاؤ سلیقۂ بے رخی کہاں ہے

حیات کے رخ پہ آج بھی ہیں فسردگی کے گھنے اندھیرے
رہِ وفا میں گماں یہ ہوتا ہے غم کوئی تشنۂ بیاں ہے

دیارِ غربت میں ہم نے دیکھا عجیب عالم ہے زندگی کا
روش روش آزمائشیں ہیں قدم قدم پر اک امتحاں ہے

وفورِ جذب جنوں ہمارا وفا کی راہوں میں گامزن ہے
رسائی کیونکر ہو شام غم تک کہ صبح جسکی دھواں دھواں ہے

انہیں ہے احساسِ ترک الفت شباب پر ہے ادھر محبت
مگر میں یہ غور کر رہا ہوں زمانہ کیوں ہم سے بدگماں ہے

کہاں ہے توقیر آدمیت کدھر ہے مہر و وفا کی عظمت
وہ چیز ڈھونڈے سے کیا ملیگی نا آشنا جس سے اک جہاں ہے

منارِ کبر و غرور اُدھر ہے ادھر حرم کی ہے پاسبانی
نہ جانے کیا حال ہوگا اسکا بیچارہ درویشؔ درمیاں ہے

اگرچہ شب جاچکی ہے لیکن سحر کا ابتک پتہ نہیں ہے
یہ بات کیا ہے، نصیب میں دن کے کوئی سورج ہے یا نہیں ہے

ہوا زمانہ مری نگاہوں میں انکا عکس حسیں ڈھلا تھا
یہ راز ہے راز آج تک بھی کہ جس سے دل آشنا نہیں ہے

رہِ طلب میں سلام کرتے ہیں جب بھی اہل نشاط مجھکو
میں ہنس کے لیتا ہوں راہ اپنی کہ غم بھی کوئی برا نہیں ہے

یہ ظرف تو دیکھئے جہاں کا ہے کسقدر بدگمان ہم سے
مجھے یقیں ہے ہم عاصیوں سے خدا بھی اتنا خفا نہیں ہے

ہے اسکی بزم وجود خود اک دلیلِ روشن اگر یقیں ہے
کرے نہ تسلیم کوئی جبتک یہ بات دل مانتا نہیں ہے

نقاب اٹھنے کی دیر ہی تھی ہزاروں سجدے مچل اٹھے ہیں
وہ آج سارے مہر بلب ہیں جو کہہ رہے تھے خدا نہیں ہے

لگائے غم آدمی کا سینے سے کہیے درویشؔ دورِ نو سے
کمی اسی کی ہے زندگی میں وگر نہ دنیا میں کیا نہیں ہے

کتنے ثابت قدم رہ گئے
جو بھی حصے کے غم رہ گئے

یاد ان کے ستم رہ گئے
عشق تیرے بھرم رہ گئے

محو حیرت بنے بزم میں
دیکھتے انکو ہم رہ گئے

عشق کی راہِ دشوار میں
چل کے ہم دو قدم رہ گئے

شام سے تا سحر ذکرِ غم
کرکے دل پر رقم رہ گئے

بنکے تصویرِ یاس و الم
کچھ شناسائے غم رہ گئے

آ گئی کام درماندگی
جتنے تھے تازہ دم رہ گئے

کعبۂ دل کی عظمت نہ پوچھ
عرش و لوح و قلم رہ گئے

ہمسفر شیخ بھی تھے مگر
آ کے قربِ حرم رہ گئے

یہ بھی کیا کم ہے میرے لئے
انکے فضل و کرم رہ گئے

وہ غزل سنکے درویش کی
لیکے دامانِ نم رہ گئے

آرزوئے جواں رہ گئی
ساتھ برقِ تپاں رہ گئی

ہستئ ناتواں رہ گئی
غم اٹھانے کو جاں رہ گئی

قصۂ غم بیاں ہو چکا
تشنگیٔ زباں رہ گئی

ذکر جب بھی کیا آپ کا
بن کے اک داستاں رہ گئی

دی نئی زندگی موت نے
مشقِ چارہ گراں رہ گئی

شکر ہے آشیاں بن گیا
برق جانے کہاں رہ گئی

خشک آنکھوں میں آنسوں ہوئے
آ کے لب پر فغاں رہ گئی

دیکھ کر انقلابِ چمن
ہاتھ ملتی خزاں رہ گئی

زندگی صرف تیرے لئے
ہو کے بے خانماں رہ گئی

دی ہے غم نے دعائے سکوں
طولِ عمر رواں رہ گئی

عشق کی سرخیٔ افسانۂ دل کہتے ہیں
اہل دل حسن کو نذرانہ دل کہتے ہیں

لذت غم سے نہیں ایک زمانہ واقف
ہم جسے گردشِ پیمانۂ دل کہتے ہیں

رشک فردوس ہے جس دل میں ہے الفت تیری
ہم بظاہر جسے ویرانۂ دل کہتے ہیں

انکو ملتی ہے جہاں دولت تسلیم و رضا
اہلِ دنیا جنہیں بیگانۂ دل کہتے ہیں

مسکنِ حیرت و امید و تمنائے حیات
وہ جگہ ہم جسے کاشانۂ دل کہتے ہیں

آج درویشؔ کا موضوعِ سخن ہے یارو
کاسۂ دل کو جو پیمانۂ دل کہتے ہیں

وفا کے سنگین مرحلوں میں جو بارِ ہستی اٹھاسکیں گے
مجھے یقیں ہے انہیں زمانے کے سارے غم راس آسکیں گے

جہاں پہ صیاد گھات میں ہے وہاں ہمارا بھی آشیاں ہے
یہ دیکھنا ہے کہ برق سے کون اپنا دامن بچاسکیں گے

تجلیوں کی کمی نہیں ہے اس عالم رنگ و بو میں لیکن
وہ جنکو تابِ نظر نہیں ہے بھلا وہ کیا تاب لاسکیں گے

یہ چاند یہ کہکشاں یہ تارے فلک پہ یہ دیدنی نظارے
تمام شب ہونگے نورِ افشاں مگر سمجھ میں نہ آسکیں گے

حیات بس معتبر وہی ہے جو غم کی راہوں میں مسکرائے
جھلس کے پروانے شمع پر بھی نہ آگ دل کی بجھاسکیں گے

جو ذہن ملت کے رازداں ہیں جو فکر قومی کے ترجماں ہیں
انہیں زمانے کی روح جانو وہی زمانے پہ چھاسکیں گے

نئی امنگیں نئے تقاضے نئے مسائل نئے مراحل
حقایقِ زندگی سے کب تک ہم اپنا دامن بچاسکیں گے

شباب تم کو اگر ملا ہو تو کرلو تعمیر گلستاں بھی
حسین لمحات زندگی کے کبھی پلٹ کر نہ آسکیں گے

زمانہ قدموں میں اُنکے ہوگا وہی برائے نشاط ہونگے
کہ سازِ ہستی پہ گاکے جو بھی پیام دل کا سناسکیں گے

جب مقدر زمانے کے غم ہوگئے
قابل ذکر دنیا میں ہم ہوگئے

دل میں احساس سوزِ تمنا لئے
ہم بھی امیدوارِ کرم ہوگئے

ذوقِ منزل اسے راس آ ہی گیا
رہنما راہ کے پیچ و خم ہوگئے

اپنی ساری وفائیں ستم ہوگئیں
لیکن انکے ستم بھی کرم ہوگئے

قافلے جو بھی گذرے تری راہ سے
رہنما ترے نقش قدم ہوگئے

جب سے ذوق جنوں کا سہارا لیا
کیا سے کیا جانے دنیا میں ہم ہوگئے

بھولنا جب بھی درویشؔ چاہا انہیں
خودبخود حوصلے دل کے کم ہوگئے

اگر غم میں تسکیں کا سامان ہوتا
تو انساں نہ غم سے پریشان ہوتا

سمجھتی رہی حادثہ اس کو دنیا
جو میرے فسانے کا عنوان ہوتا

جو ہوتا یقیں راہبر بحرِ غم میں
نہ کشتی کو پھر خوف طوفاں ہوتا

میرے نغمہ ہائے دل آویز سن کر
وہ اے کاش مجھ پر مہربان ہوتا

نہ حسرت ہی ہوتی نہ غم کوئی ہوتا
کوئی ان سے ملنے کا سامان ہوتا

کم از کم وہ درویشیؔ غم زدہ پر
ستم بھی جو کرتے تو احسان ہوتا

جب دل کو غم ہستی کا اگر ہم رنگ بنانا آجائے
انساں کو حیاتِ انساں کی توقیر بڑھانا آجائے

اس جہد و طلب کی دنیا میں گفتارِ محض لا حاصل ہے
کہنے سے زیادہ بات یہ ہے کچھ کرکے دکھا نا آجائے

آغازِ محبت کا سودا گر مفت ملے منظور نہیں
انجامِ محبت کی خاطر ہر چیز لٹانا آجائے

منزل کی طلب آسان نہیں دوگام چلیں طئے ہوجائے
منزل کے لئے پہلے اپنی ہستی کو مٹانا آجائے

یہ عشق ہے کاروبار نہیں کیا سود و زیاں کا ذکر یہاں
اس راہ میں کھوکر ہی پہلے ممکن ہے کہ پانا آجائے

منظور ہو ذوقِ گلچینی گلزارِ جہاں میں اے ہمدم
لازم ہے کہ کانٹوں سے پہلے دامن کو بچانا آجائے

ہر بات میں طرزِ دلداری ہر حال میں ذوقِ غم خواری
اس دو راہے پر درویشی اے کاش زمانا آجائے

دل بھی تیرے کرم کا سودائی
سر بھی آمادۂ جبیں سائی

ہم ادھر دید کے تمنائی
ہے ادھر انکو پاسِ رسوائی

صحنِ گلشن میں آج کانٹوں کی
میرے دامن نے کی پذیرائی

کتنا آساں ہے غم میں رولینا
کتنی دشوار ہے شکیبائی

منزلِ شوق کوئی دور نہیں
ہو اگر ذوقِ آبلہ پائی

بڑھ گئے حوصلے میرے دل کے
درد نے جب بھی لی ہے انگڑائی

اپنی ہستی ہے آئینہ خانہ
خود تماشہ ہے خود تماشائی

کتنے ہاتھوں نے مجھ کو تھام لیا
لغزش پا بھی کتنی کام آئی

کچھ نہ پوچھو ہجوم یاس و الم
انجمن بن گئی ہے تنہائی

بزم اہل سخن میں درویشی
تیری طرزِ جنوں پسند آئی

نظامِ نو کے نقیبو ذرا ادھر آؤ
مآلِ انفس و آفاق کیا ہے سمجھاؤ

زمام زیست ابھی جبر کی گرفت میں ہے
حوادثِ غم و آلام سے نہ گھبراؤ

نہ چھیڑو وقت کی سرگوشیوں کا ذکر ابھی
سرور بن کے میری انجمن میں آجاؤ

نئی حیات کے در باز ہونے والے ہیں
نظر کو منظرِ بام و در کریں آؤ

عجیب چیز نہیں ذوقِ میکشی لیکن
مزا تو جب ہے کہ ساقی پرست بن جاؤ

سکوں تو یوں بھی میسر ہے دیدہ و دل کو
کچھ اور بھی رگِ جاں کے قریب آجاؤ

تمہیں حسین ستاروں کی چاند کی سوگند
ہمارے سامنے آتے ہوئے نہ شرماؤ

وہ اہلِ حسن کہ اہل کرم ہوں درویشی
کسی کے آگے نہ دستِ سوال پھیلاؤ

بات آ پڑی ہے عشق کے ماروں میں دوستو
کیوں دلکشی نہیں ہے بہاروں میں دوستو

سمجھا رہا ہے مجھ کو غم زیست کا مآل
فصلِ خزاں کا رنگ اشاروں میں دوستو

جو آرزو تھی خواب کی دنیا میں کھوگئی
نظریں بھٹک رہی ہیں نظاروں میں دوستو

وہ حسن وہ کشش و تبسم کی جھلکیاں
باقی کہاں ہیں چاند ستاروں میں دوستو

ہشیار چھوٹ جائے نہ پتوار ہاتھ سے
طوفانِ تند و تیز کے دھاروں میں دوستو

منزل تو ایک حدِ تعین کا نام ہے
کیا ڈھونڈتے ہو رہگزاروں میں دوستو

ہر شعر میں غزل کے ہے عکسِ جمالِ یار
درویش بھی ہے آئینہ داروں میں دوستو

اخلاص و وفا بدنام ہوئے اپنے بھی ہوئے ہیں بیگانے
اس دور میں دل بے قسمت ہیں ٹوٹے ہوئے جیسے پیمانے

تکمیل جنوں طوفانِ بلا معراجِ یقیں توقیرِ وفا
بابِ غمِ ہستی اہل خرد دنیا کو چلے ہیں سمجھانے

یہ خاک ہے پروانوں کی سی گو اسمیں نہیں جنبش کوئی
تم شمع جلا کر تو دیکھو خود رقص کرینگے پروانے

غنچوں سے تبسم دور سہی مانا کہ چمن بے نور سہی
کچھ موسمِ گل کی بات کرو رہنے دو خزاں کے افسانے

کیا بھول ہوئی ہے ساقی سے کچھ اسکا سبب معلوم نہیں
تم نظریں اٹھاکر تو دیکھو خود لوٹ کے آئیں میخانے

کیا بھول ہوئی ہم سے آخر کچھ اسکا سبب معلوم نہیں
مدت ہوئی ہم میخواروں سے کیوں روٹھ گئے ہیں میخانے

دکھ درد کی قیمت کیا شئے ہے احساسِ الم کہتے ہیں کسے
اُس ذوقِ نظر کا کام ہے یہ جو اپنی حقیقت پہچانے

ہے منزل ہستی درویشی پرخار ہمیں تسلیم مگر
کانٹوں کی چبھن سہنے کے لئے باقی ہیں ابھی کچھ دیوانے

ڈھونڈتے ڈھونڈتے تجھے آخر
تا حدِ جاں پہنچ گیا رہرو

دور تک نقشِ پا نہیں کوئی
جانے کس سمت مڑ گیا رہرو

راہ میں رہزنوں کے نرغے سے
بچکے آگے نکل گیا رہرو

مجھ کو درپیش ہے نئی منزل
چاہیے اب کوئی نیا رہرو

ایک آفاق گیر پہنائی
راہ تکتی ہے تیری آ رہرو

راہ میں گر قدم رکیں تو رکیں
جرأت شوق آزما رہرو

عرش و فرش اپنے دم سے ہے قائم
پھر یہ اوج و نشیب کیا رہرو

اپنے عزم جواں سے تاروں کو
اٹھ کے گرد سفر بنا رہرو

ایک صورت سکوں کی کیا ہے یہی
درد کو راہبر بنا رہرو

موت سرگشتہ زندگی حیراں
حوصلہ تیرا مرحبا رہرو

برق کو تجھ سے کیوں عداوت ہے
کیا کوئی واقعہ ہوا رہرو

لذتِ غم تو بخش دے دل کو
حوصلہ بھی اسے سکھا رہرو

زندگی کی ان تیرہ راہوں میں
آپ اپنا ہے رہنما رہرو

شعر و نغمہ رباب کی صورت
بزم عالم شباب کی صورت

وہ تبسم خفیف سا لب پر
نودمیدہ گلاب کی صورت

جام اٹھایا تھا سامنے آئی
اک حسیں اجتناب کی صورت

انکے ماتھے پہ میں نے دیکھی ہے
شبنم و آفتاب کی صورت

مجھ میں اب جرأت سوال کہاں
خود نظر ہے جواب کی صورت

خیر سے رات کٹ گئی غم کی
رہ گئی اضطراب کی صورت

داستان حیات سامنے ہے
اک ادھوری کتاب کی صورت

کچھ تو مفہوم زندگی بدلے
ہو کوئی انقلاب کی صورت

کوئی محتاج التفات نہ ہو
دل خانہ خراب کی صورت

زندگانی ہے خوابِ نیم شبی
موت تعبیرِ خواب کی صورت

خستہ حالی نے بخش دی ہمکو
غمِ دوراں شراب کی صورت

عنبریں گیسوؤں کے سائے میں
چھپ گئی ماہتاب کی صورت

سامنے آگئے وہ آنکھوں کے
دفعتاً انتخاب کی صورت

شب کا پچھلا پہر ہے درویشی
شعر ڈھلتے ہیں خواب کی صورت

آواز سحر کانوں میں رس گھول رہی ہے
محسوس یہ ہوتا ہے غزل بول رہی ہے

بے ساغر و بادہ میری مخمور نگاہیں
ساقی کی نگاہوں کا بھرم کھول رہی ہے

فطرت پئے تعمیر گلستانِ وفا کی
ہر دور میں وابستۂ ماحول رہی ہے

گذری تھی کبھی سایۂ گیسو میں جنوں کے
وہ ایک گھڑی عمر کی انمول رہی ہے

اس شوخ کی اللہ رے انگڑائی کا عالم
جیسے کوئی موجوں پہ کرن ڈول رہی ہے

اعجازِ مصور کی ہے غماز سراپا
تصویر وہ تصویر کے جو بول رہی ہے

یہ وقت ہے درویشؔ کرو فکرِ نشیمن
بجلی ہے کہ ہر سمت سے پرتول رہی ہے

اٹھو سنائیں کوئی فسانہ یہ عنبریں رات ڈھل نہ جائے
مگر وفا کا نہ ذکر چھیڑو کہیں مرا دل دہل نہ جائے

یہ شبنمی رات یہ خموشی یہ ماہتاب و حسین تارے
مجھے یہ ڈر ہے کہ اس فضا میں مرا تخیل مچل نہ جائے

کہیں امیدیں ہی دیں نہ دھوکہ کہیں سہارے ہی لے نہ ڈوبیں
اسی کشاکش میں زندگی روٹھ کر کسی رخ نکل نہ جائے

جو زخم دل کو عطا ہوئے ہیں اب ان میں لذت سی پا رہا ہوں
نہ کیجئے ذکر چارہ گر سے کہ درد پہلو بدل نہ جائے

یہ سن کے نظروں نے میری اپنا وقار کھویا ہے گلستاں میں
گلوں کے رخ زرد ہو نہ جائیں کلی کہیں خوں اگل نہ جائے

جنوں کو سائے میں گیسوؤں کے سکون ملنے لگا جب ہے سے
شعور بیدار ہورہا ہے ، خرد بھی شاید سنبھل نہ جائے

بہار اپنے شباب پر ہے خزاں کا موسم بھی خوب تر ہے
ذرا سنبھل کر نظر اٹھاؤ کہ نظم گلشن بدل نہ جائے

ہم اپنے دل میں بڑے سلیقے سے ظرفِ توبہ لئے ہوئے ہیں
یہ ساقیٔ میکدہ سے کہدو کہ مئے سبو سے اچھل نہ جائے

مسائل حاضرہ پہ درویشؔ تبصرہ اس طرح سے کیجئے
کہ بات دل کی بیان بھی ہو اور آبروئے غزل نہ جائے

جب بھی ترے خیال کی تصویر پڑھ لیئے
محسوس یوں ہوا خطِ تقدیر پڑھ لیئے

دل مبتلائے درد ہوا اور ہم ادھر
خوابِ غم حیات کی تعبیر پڑھ لیئے

وارفتگانِ دشت نوردِ حیات سے
کیا چاہتی ہے پاؤں کی زنجیر پڑھ لیئے

کوندی جو برق روئے فلک پر زہے نصیب
ہم حسنِ لا زوال کی تنویر پڑھ لیئے

رخ سے ادھر نقاب اٹھانے کی دیر تھی
خود بینیِ جمال کی توقیر پڑھ لیئے

اٹھا جو دل میں عشق کا ذوقِ مصوری
عکسِ رخِ حیات کی تفسیر پڑھ لیئے

درویشؔ التفاتِ گریزاں کے باوجود
آنکھوں سے ان کی شوخی تحریر پڑھ لیئے

جب بھی خوابیدہ ولولے جاگے
زلفِ گیتی کے سلسلے جاگے

خار زارِ حیات میں کتنے
رہ نوردوں کے آبلے جاگے

ہوش و مستی میں فرق مشکل ہے
جب نگاہوں کے فیصلے جاگے

بن گئی چارہ گر حیات مری
جب بھی غم کے معاملے جاگے

شمعِ بزم کیا خبر تجھ کو
رات بھر کتنے دل جلے جاگے

جادہ پیمائی تصور میں
تری یادوں کے قافلے جاگے

بات تو ہم نے کی زمانے کی
دل میں لیکن کئی گلے جاگے

زیرِ سایہ جنوں کے درویشی
فکر شعری کے حوصلے جاگے

راہ میں جب کبھی الیاس و خضر آئے ہیں
فاصلے اور بھی دشوار نظر آئے ہیں

یہ تو ہے بزم گہہ ناز خدا خیر کرے
وحشت دل لیئے ہم جانے کدھر آئے ہیں

پا کے شبنم کی نمو کتنے گلوں کے چہرے
دامنِ صحنِ گلستاں پہ نکھر آئے ہیں

قافلے والو مبارک ہو تمہیں کو منزل
ہم یہاں تک تو فقط بہر سفر آئے ہیں

کر کے موجوں کے حوالے دل امید و وفا
کتنے طوفانِ حوادث سے گذر آئے ہیں

ان میں کچھ خوگرِ تسلیم و رضا ہیں شاید
جو تری بزم میں بادیدۂ تر آئے ہیں

ساقیا چھوڑ بھی دے جام و سبو کی باتیں
آج محفل میں تری اہل نظر آئے ہیں

نرگس و لالہ و گل کا تھا تصور لیکن
جانے کیوں آپ میرے دل میں اتر آئے ہیں

رات بھر جل کے شبستانوں میں مانند چراغ
اپنے ہمراہ لیئے نورِ سحر آئے ہیں

دامنِ عشق کی توقیر بڑھانے کے لیئے
تارے افلاک سے پلکوں پہ اتر آئے ہیں

تیری ہر وقت رہی چاک گریباں پہ نظر
کیا انہیں دیکھا ہے جو چاک جگر آئے ہیں

یہ نوازش ہے مری طبع رواں کی درویشؔ
قلب میں شعر کے جو نقش ابھر آئے ہیں

ہے میرے خوابِ محبت کی ابتدا لمحے
جو دے رہے ہیں مجھے دور سے صدا لمحے

فریب کس لیئے کھائے تھے شوخ نظروں کے
دلوں کے راز سے ہیں خوب آشنا لمحے

فضائے عرصۂ ناپائیدار ہستی میں
حیات و موت کا دینے لگے پتہ لمحے

رخ اپنا دامنِ فصل بہار میں ڈھانکے
چمن میں لوٹ کے آئے ہیں پر فضا لمحے

بہ فرطِ شوق چلے آئے دیکھئے کیا ہے
اس انجمن میں لیئے عرضِ مدعا لمحے

یہی سبب ہے کہ گستاخیوں پہ مائل ہے
جو دے گئے تھے نگاہوں کو حوصلہ لمحے

تمہاری راہ سے دار و رسن کی منزل تک
گذارے ہم نے بڑے صبر آزما لمحے

نہ جانے کس لیئے گلشن میں کر رہے ہیں ادا
روش روش پہ بہاروں کا شکریہ لمحے

تمہاری یاد میں جو روز و شب گذرتے ہیں
وہ اور ہوتے ہیں ماحول سے جدا لمحے

خودی کو جب کبھی درویشؔ میں نے دی آواز
نہ دل نے ساتھ دیا اور نہ بے وفا لمحے

کسی کی زلفِ پیچاں جب گلے کا ہار ہوتی ہے
وہی زنجیر پا بنکر فرازِ دار ہوتی ہے

جہانِ عشق میں فتنہ نگاہِ یار ہوتی ہے
کبھی اقرار ہوتی ہے کبھی انکار ہوتی ہے

بڑی رنگیں بڑی خوش کن بڑی شہکار ہوتی ہے
تصور سے بھی بڑھ کر داستانِ یار ہوتی ہے

بہار آئی تو ہے لیکن مرے ذوقِ تمنا کو
میسر دیکھئے کب جرأت دیدار ہوتی ہے

تمہاری یاد سے دل کو سکوں ملتا تو ہے اکثر
جب حد سے بڑھ جائے تو نوک خار ہوتی ہے

نظر آتے ہیں ہم کو کچھ نقوشِ زندگی اپنے
نگاہِ وقت جب بھی آئینہ بردار ہوتی ہے

مچل اٹھنے دو جلوں کو ذرا ہم بھی تو دیکھیں گے
نظر باکار میری یا نظر بیکار ہوتی ہے

چمن میں آج کوئی دیدہ ور آنے کو ہے شاید
نظر افروز چشمِ نرگسِ بیمار ہوتی ہے

کوئی تردید تو کرلے ذرا اس بدگمانی کی
نشاط و غم کی یکجائی بڑی دشوار ہوتی ہے

ہمیں سفر کی تھکن ہے نہ رہگذر کی تھکن
کہیں نہ راہ سے لوٹا دے راہبر کی تھکن

زبان حال سے پوچھو نہ قافلے والو
کسی کی راہ میں بھٹکے ہوئے خضر کی تھکن

وفورِ جذب تماشا بنا ہوا ہے ابھی
سمجھ میں آ نہ سکی ترے سنگ در کی تھکن

غم حیات کو آسودگی عطا کرنے
سمٹ کے آئی ہے آنکھوں میں عمر بھر کی تھکن

ملے جنوں کو اگر آگہی تو عرض کروں
فراق و ہجر میں کیا چیز ہے نظر کی تھکن

حجاب رخ پہ نظر سے نظر بچاتے ہوئے
میرے قریب سے گذرے ہیں مسکراتے ہوئے

شکست دل کی تلافی نہ ہوسکی ابتک
زمانہ بیت گیا حالِ دل سناتے ہوئے

تمہاری یاد کے پرتو ہیں خلوت دل میں
کسی چراغ کے مانند جگمگاتے ہوئے

غمِ حیات کو مسرور و شادماں پاکر
لی راہ اپنی حوادث نے لڑکھڑاتے ہوئے

خزاں نے ڈھونڈلیا گوشۂ پناہ اگر
چمن کا رخ نہ کریگی بہار آتے ہوئے

ترے جمالِ نظر سوز کی قسم اے برق
گریز کر نہ میرا آشیاں جلاتے ہوئے

میں خوش ہوں دل کو میسر ہے دردِ بے درماں
وہ مطمئن ہیں مرا ظرف آزماتے ہوئے

بھٹک نہ جائیں اندھیروں میں قافلے غم کے
طلوعِ شب سے ہی بیٹھے دل جلاتے ہوئے

لبوں کی لرزش پیہم ہے اک شکستہ ساز
تمام عمر ہوئی یوں ہی گنگناتے ہوئے

بگڑ نہ جائے کہیں نظمِ میکدہ ساقی
ہے احتیاط بھی لازم نظر اٹھاتے ہوئے

کچھ اپنی وضع کا کیجئے خیال درویشی
کسی کے سامنے دستِ طلب بڑھاتے ہوئے

نظر فروز ہیں حسن و شباب کے شعلے
بھری بہار میں جیسے گلاب کے شعلے

خفیف سا وہ تبسم جھکی جھکی وہ نظر
مچل نہ جائیں کہیں اضطراب کے شعلے

کھلے ہیں دیر میں چل کے میری وفا کے نصیب
کچھ آج سرد ہیں چشمِ عتاب کے شعلے

وہ چار تنکے جو باقی ہیں آشیانے میں
اب انکی تاک میں ہیں برق تاب کے شعلے

نقیب مرگ نہ بن جائیں اہل غم کے لیئے
یہ واقعات کی صورت میں خواب کے شعلے

جو انکے رخ پہ نظر کی تو تمتما اٹھے
ادا و ناز میں لپٹے حجاب کے شعلے

مزاجِ حسن تغزل ہرا بھرا ہی رہا
کبھی جلا نہ سکے انقلاب کے شعلے

رفیق ہیں میرے درویش ظلمت شب میں
چراغ عزم یقین ماہتاب کے شعلے

تو جو منجملۂ احبابِ نظر ہے ساقی
سارا میخانہ ترے زیرِ اثر ہے ساقی

میں جو میخانہ بہ میخانہ چلا آیا ہوں
میرے دامن پہ ابھی گردِ سفر ہے ساقی

وہ مئے تند کہ میں ہوش سے بیگانہ رہوں
فکرِ عقبیٰ غمِ دوران میرے سر ہے ساقی

شمعِ ساغر و مینا سے اجالا کردے
میکدہ میں ابھی ظلمت کا گذر ہے ساقی

اتنا کم ظرف نہیں ہوں کروں غیروں سے طلب
تو پلائے تو بھلا کس کو مفر ہے ساقی

میکدہ اس کا ہے جام اس کا ہے مئے اس کی ہے
جو تری ذات سے وابستہ اگر ہے ساقی

موجِ مئے میں ترے نازک سے تبسم کی ضیاء
مثلِ تابندگی سلکِ گہر ہے ساقی

مجھ کو جانا ہے رہِ دیر و حرم سے بچ کر
اس جگہ پہ جو تری راہ گذر ہے ساقی

ایک تہمت لیئے جاؤں گا مگر اتنا بتا
میرا ٹوٹا ہوا پیمانہ کدھر ہے ساقی

شرط انصاف نہیں میکدۂ عالم میں
جام چھلکے ہے کہیں دیدۂ تر ہے ساقی

روحِ احساس کو مینائے غزل میں بھردے
تجھ کو درویشؔ کا کچھ پاس اگر ہے ساقی

در پردہ میرے دل کی یہ خواہش تو نہیں ہے
اظہارِ غم عشق گذارش تو نہیں ہے

دل درد کا محرم نہ تھا اتنا کبھی پہلے
اے ضبط الم تیری نوازش تو نہیں ہے

موجوں نے ڈبویا ہے سفینہ لب ساحل
طوفانِ بلا خیز کی سازش تو نہیں ہے

کلیوں کے جگر چاک ہیں رخ زرد گلوں کے
زخموں کی گلستاں میں نمائش تو نہیں ہے

اب دیکھنا یہ ہے وہ تسلیم و رضا میں
پاؤں میں یقیں کے کہیں لرزش تو نہیں ہے

سنتا ہوں حوادث کے دبے پاؤں کی آہٹ
زنجیر قفس درپئے شورش تو نہیں ہے

وہ کرے داد طلب اہلِ سخن سے
ایسی کوئی درویش کی خواہش تو نہیں ہے

حکایت غم پنہاں نہیں ہے عام بہت
نہ کر چمن میں بہاروں کا اہتمام بہت

غمِ حیات کے لمحے ہیں تیز گام بہت
ابھی جہاں میں فسانے ہیں ناتمام بہت

کیا جو دل نے ترے غم کا احترام بہت
ہوا نصیب وفا کو مری دوام بہت

خمارِ تشنگی ساقی تجھے بتادیگا
کیا تھا میں نے عبث انتظارِ جام بہت

کہیں نہ ذوقِ تجسس کو نیند آجائے
رہِ طلب میں نہ کرنا کبھی قیام بہت

ترے کرم پہ ، یہ مانا مدارِ ہستی ہے
مگر مزاجِ زمانہ ہے تلخ کام بہت

ادھر افق پہ عیاں ہے کسی کے دل کا لہو
ادھر ہے زرد رخِ آفتابِ شام بہت

وہیں پہ اپنا بھی چھوٹا سا آشیاں ہے جہاں
چمن میں برق کے پھیلے ہوئے ہیں دام بہت

سنبھل سنبھل کے اٹھاؤ نگاہ درویشی
بپا ہے بزم میں جلووں کا اژدہام بہت

یقیں محکم ارادے جسکے پائندہ نہیں ہوتے
متاعِ زیست پاکر بھی وہ دل زندہ نہیں ہوتے

جو پروانے چراغِ زندگی کی لو پہ جلتے ہیں
وہ خاموشی سے جل جاتے ہیں رقصندہ نہیں ہوتے

الٹ دینگے نقاب اک دن ترے دیوانے یہ کہہ کر
مناظر حسنِ فطرت کے برافگندہ نہیں ہوتے

خزاں جب تک رہے سایہ فگن اس صحنِ گلشن میں
کبھی کھل کر دہن غنچوں کے رخشندہ نہیں ہوتے

بخوبی جانتے ہیں راز ہائے جادہ و منزل
ہم اپنی لغزشِ پیہم سے شرمندہ نہیں ہوتے

نہ ہوتی ماہ و انجم کی اگر سازش اندھیروں سے
شب تاریک میں وہ اتنے تابندہ نہیں ہوتے

نقوشِ غم اگر پڑھنا ہو لوحِ دل پہ پڑھ لینا
کسی کتبہ کی طرح رخ پہ وہ کندہ نہیں ہوتے

جو اپنی وسعتِ فکر و نظر سے ہاتھ آتے ہیں
وہ افسانے خیالاتِ پراگندہ نہیں ہوتے

بہاروں میں کبھی درویشؔ ایسا بھی تو ہوتا ہے
چٹک جاتے تو ہیں غنچے مگر خندہ نہیں ہوتے

ذوق ترک وفا دیکھتے دیکھتے
عام ہوتا گیا دیکھتے دیکھتے

ساقیا جام ہستی اٹھا شوق سے
چھا گئی ہے گھٹا دیکھتے دیکھتے

تھے جو نا آشنائے حرم آج وہ
بن گئے ہیں خدا دیکھتے دیکھتے

آتشِ غم کو یادوں نے جب دی ہوا
آشیاں جل گیا دیکھتے دیکھتے

منزلِ ذوق اسے کام آ ہی گیا
فاصلہ گھٹ گیا دیکھتے دیکھتے

چاند تاروں کا وقت سحر چرخ پر
کارواں لٹ گیا دیکھتے دیکھتے

اب ستارے بھی پلکیں جھپکنے لگے
ان کے رخ کی ضیا دیکھتے دیکھتے

دولتِ حسن پر اپنی نازاں ہیں وہ
ہر گھڑی آئینہ دیکھتے دیکھتے

ان کی نظروں سے نظریں ملی آ گیا
بے خودی کا مزا دیکھتے دیکھتے

ہو کے پامال ہم سرخ رو ہو گئے
رنگ لائی حنا دیکھتے دیکھتے

جانے غنچوں سے کیا کہہ گئی ہے صبا
کھل گئی ہے قبا دیکھتے دیکھتے

ان کی راہوں میں نظریں بچھی رہ گئیں
رات بھر راستہ دیکھتے دیکھتے

جبر کی آج پھر سے بدلنے کو ہے
کوشش ناروا دیکھتے دیکھتے

جانے کیوں آج بے منتِ چارہ گر
درد کم ہو گیا دیکھتے دیکھتے

حوصلہ اہل محفل نے درویش کا
آزما ہی لیا دیکھتے دیکھتے

ہر کو حیات کی ہمورا دیکھ کر
نازاں ہے وقت جذبۂ بیدار دیکھ کر

عنواں بدل رہے ہیں غم روزگار کے
ذوقِ ستم کو درپئے آزار دیکھ کر

قندیل مصلحت کو فروزاں نہ کیجئے
اہل جنوں میں ہوش کے آثار دیکھ کر

اندازۂ طلاطم و طوفاں کئے بغیر
کشتی رواں ہے شوخی منجدھار دیکھ کر

ہے خسروانِ جبر و سیاست بھی دم بخود
یوں جذبِ سرفروشی کا میعار دیکھ کر

مشکل سہی طویل سہی جادۂ حیات
رک جایئے نہ سایۂ دیوار دیکھ کر

دل آج اعتدال کی حد سے نکل گیا
جنسِ وفا کا ان کو خریدار دیکھ کر

خود اپنے دل کو جبر کا خوگر بنالیا
دنیائے حادثات کا انبار دیکھ کر

گستاخ ہوگئیں ہیں نگاہیں خطا معاف
کھلتے ہوئے گلاب سے رخسار دیکھ کر

یہ آپ ہیں کہ یا کوئی جھونکا نسیم کا
اک تجزیہ ہے آپ کی رفتار دیکھ کر

سرگشتگی موت پہ حیراں ہے زندگی
میری جبینِ ناز کو خوّار دیکھ کر

تمہارا حسن خمارِ مئے شبانہ ہے
شباب کیا ہے مکمل شراب خانہ ہے

یہ بات کاش سمجھ سکتے اہل ہوش و خرد
غمِ حیات بھی جینے کا اک بہانہ ہے

ادا تمہاری اگر فتنۂ قیامت ہے
مری نظر کا بھی ہر فعل مجرمانہ ہے

قدم قدم پہ جہاں زندگی سنورتی ہے
سمجھ سکو تو یہ دنیا نگار خانہ ہے

میں ان کے حسن تغافل سے بدگماں تو نہیں
مجھے شکایت بے مہریٔ زمانہ ہے

کس اہتمام سے کاٹی ہے رات فرقت کی
ابھی تک آنکھوں میں کیفِ مئے شبانہ ہے

جو ڈھال لیتا ہوں لفظ و بیاں کے سانچے میں
وہ شعر تری محبت کا اک فسانہ ہے

یہ درد و کرب میں ڈوبی ہوئی نوا درویشؔ
شکستہ ساز پہ چھیڑا ہوا ترانہ ہے

ذکر آپ کا شریک ہو جب زندگی کے ساتھ
آفات سو ہزار گوارہ خوشی کے ساتھ

دنیا نہیں قبول جو دیں بے دلی کے ساتھ
اتنا رہے لحاظ غم آدمی کے ساتھ

چھلکا کیئے ہیں اشک کسی جام کی طرح
دل بھی شریک ہے مری بیچارگی کے ساتھ

اہل وفا سے رنجش بیجا فضول ہے
پیش آیئے کبھی تو کشادہ دلی کے ساتھ

اتنا تو جانتا ہوں کہ بس میں نہیں مرے
وابستہ ہوگیا ہے میرا دل کسی کے ساتھ

کتنا نظر فریب ہے نظارۂ چمن
شبنم گلوں کے ساتھ صباحت کلی کے ساتھ

منظور امتحان تھا ساقی کے ظرف کا
ہم میکدے میں آئے ہیں جامِ تہی کے ساتھ

درویشؔ کون کس کا کفیل حیات ہے
تسلیم ہے یہ بات ازل سے خودی کے ساتھ

کیسے کیسے ہمارے ہیں غم خوار
دل میں ہے دشمنی لبوں پر پیار

چشم ساقی ہو تیری عمر دراز
تجھ سے باقی ہے میکدے کا وقار

طولِ عمر رواں نہ پوچھ ہم سے
دھوپ میں جیسے سایۂ دیوار

جو بھی اپنی خودی کو کھو بیٹھے
وقت نے کردیا ذلیل و خوار

فاصلے بڑھ گئے کشاکش کے
ہوگئی دور منزلِ اظہار

آج کیا ہوگیا تجسس کو
چھین لی کس نے طاقت گفتار

غمِ دوراں ذرا توقف کر
دیکھ لوں میں بھی وقت کی رفتار

ہائے مشاطگیِ عشق نہ پوچھ
چاکِ دامن ہیں اب گلے کے ہار

بت پرستی ہو یا کہ بت شکنی
دونوں آساں ہیں دونوں ہیں دشوار

درد نے بھی زبان پائی ہے
شام ہی سے سحر کے ہیں آثار

ہر تشنۂ احساس کو بادیدۂ تر کر
ڈھلتے ہوئے اشکوں کو تو ہمرنگ گہر کر

اے شام الم خوف نہ کر تیرہ شبی کا
تابندہ اسی شب سے سحر ہوگی سنور کر

غربت میں تری یاد کا عالم ارے توبہ
مٹتا ہے ہر اک نقش میرے دل پہ ابھر کر

اے حسنِ فروزاں نہ جلا دامانِ دل کو
جلووں کو ذرا اور بھی پابند نظر کر

پروردۂ شبنم میں دم صبح چمن میں
کلیاں جو دمکتی ہیں سرِ شاخ نکھر کر

مجھ کو تو ترے وعدۂ فردا پہ یقیں ہے
للہ نہ اب تذکرۂ شام و سحر کر

منزل تو تری ہے یہی اے طالب منزل
ہر فاصلۂ دشت کو تو گردِ سفر کر

درویشؔ چلیں ساتھ ترے جادہ و منزل
طے مرحلۂ عشق کی یوں راہ گذر کر

پلکوں کو اپنی خون جگر میں ڈبوئے ہیں
کس تمکنت سے دامنِ شب کو بھگوئے ہیں

داغِ غمِ فراق کو اشکوں سے دھوئے ہیں
یہ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے روئے ہیں

ہوکر غمِ حیات کی تلخی سے جاں بلب
خود ہی متاعِ ضبط کو ہاتھوں سے کھوئے ہیں

نہ پوچھ ہم نے بزمِ فلک سے تمام رات
کتنے نجوم چشم تمنا میں بوئے ہیں

سوجھا ہے ایک تجربہ ختم سفر کے بعد
راہوں نے کتنے پاؤں میں کانٹے چبھوئے ہیں

انجام گل پہ رک گئی دریشؔ جب نظر
کلیوں سے ہم لپٹ کے بڑی دیر روئے ہیں

یہ بھی ہے ایک ضبطِ غم کی مثال
شب کے نالے اثر سے دور رہے

خیر اتنی تو مہربانی کی
دل میں رہ کر نظر سے دور رہے

مجھ سے ربطِ حیات ہے ایسے
شام جیسے سحر سے دور رہے

جادۂ عشق میں جنوں سے کہو
عقلِ آوارہ تر سے دور رہے

کر کے خود اپنے درد کا درماں
تہمتِ چارہ گر سے دور رہے

بارہا شرمسار ہو کر بھی
آپ کے سنگِ در سے دور رہے

پی گیا غم کو دیدۂ احساس
گرچہ فکر بشر سے دور رہے

مری پلکوں پہ آرہے شب بھر
جو ستارے قمر سے دور رہے

تیرے ناموسِ وفا کی خاطر
احتیاطاً نظر سے دور رہے

دل کے داغوں میں روشنی کیسی
جب کہ برق و شرر سے دور رہے

گونجے نہ گلستاں میں کہیں نالۂ بلبل
کلیوں سے چھپاتے رہے ہم حادثۂ گل

بنتے ہیں بنے پاؤں کی زنجیر حوادث
لازم ہے بہر حال ہمیں صبر و تحمل

افسردہ و خاموش ہے دنیائے تمنا
کس درجہ بھیانک ہے شب غم کا تسلسل

میں دولتِ احساس ابھی بانٹ رہا ہوں
اے گردشِ ایام ذرا اور تامّل

دنیا میں بڑی بات ہے نسبت ترے در سے
میں ڈھونڈ رہا ہوں ابھی اربابِ توکل

افسانہ ہے دراصل کوئی دام نہیں ہے
وہ شہر نگاراں ہو کہ ہو حلقۂ کاکل

شوخی میں متانت ہے شرارت میں حیا بھی
اللہ رے اس شوخ کا اندازِ تخیل

جلوے ہیں نظر ساز بھی پابند نظر بھی
ہے دیدنی محفل میں ترا حسنِ تغافل

جب تک نہ ہو شائستۂ آدابِ جنوں دل
درویشؔ نہ آئیگا کبھی رنگ تغزل

کیا کچھ ایسے بہاروں نے اہتمام صلیب
ہر ایک شاخ کو ہے حکم التزام صلیب

تھکن کا نام ہے منزل نہ ڈھونڈ سایہ کو
کہیں یہ راہ میں بن جائیں خود نہ دامِ صلیب

قسم ہے عظمت عیسیٰ کی جسنے سونپا ہے
ہم اہلِ عشق کو تاحشر انتظامِ صلیب

یہاں تو عشق بھی رہزن جنوں بھی ہے بدنام
ازل سے دہر میں دونوں ہیں زیرِ دامِ صلیب

قبول مجھ کو دل و جاں سے راہِ الفت میں
قدم قدم پہ ہے درپیش گر مقامِ صلیب

حیاتِ دائمی لکھی تھی جن کی قسمت میں
انہیں کے نام سے آتے رہے پیامِ صلیب

جہاں میں آج بھی ہے دعویٰ حقِ عام مگر
نہ سرفروشی کی خو ہے نہ احترام صلیب

شفق کو دیکھ کے ہوتا ہے یہ گماں شاید
فلک مناتا ہے ہر روز جشن شامِ صلیب

یہ ذوقِ عیش پسندی بہ زعمِ خود نفسی
خدائے جبر نہ بدلے کہیں نظامِ صلیب

مقام دار ہو درویشؔ کوئے مقتل ہو
جنوں کے ہاتھ میں تھامے ہوئے زمامِ صلیب

سعیِ وقت کا حامل دیکھوں
ایک طوفاں لبِ ساحل دیکھوں

دامنِ گل کو مہکتا پاکر
شاخ پر جشنِ عنا دل دیکھوں

کیسی توہینِ محبت ہوگی
آپ کو دل کے مقابل دیکھوں

کرکے تسلیم مشورہ دل کا
پاؤں میں رقصِ سلاسل دیکھوں

حسرت و یاس کو ملے نہ زبان
کاش ایسا بھی کوئی دل دیکھوں

چاند کی طرح ظلمت شب کے
دوش پر صبح کی محمل دیکھوں

آپ ہی آپ نظر آئیں مجھے
آئینہ جب بھی مقابل دیکھوں

ایک احسان ہے کہ یاد تری
درد کی راہ میں حائل دیکھوں

موت ذوقِ سفر کی ہے درویشؔ
راہ میں جب کوئی منزل دیکھوں

تری یادوں کے در و بام سلگ اٹھے ہیں
جیسے کچھ دیپ سرِ شام سلگ اٹھے ہیں

اوس میں ڈوبی ہوئی آئی صبح کی دلہن
نکہت و نور کے پیغام سلگ اٹھے ہیں

خیر ہو تشنہ لبو آج سرِ میخانہ
چشمِ ساقی میں کئی جام سلگ اٹھے ہیں

خار و سوزن کی طرح زہر لیئے ہونٹوں پر
آپ کیوں سن کے میرا نام سلگ اٹھے ہیں

حوصلے اور بڑھے دشت نوردی کے مرے
چند کانٹے جو بہرگام سلگ اٹھے ہیں

نبض ڈوبی جو ستاروں کی دمِ آخر شب
دامنِ صبح پہ الزام سلگ اٹھے ہیں

سینۂ شب سے بھڑکتے ہوئے شعلوں کی طرح
ہم بھی اے گردشِ ایام سلگ اٹھے ہیں

درد کے شہرِ تمنا میں قدم رکھتے ہی
حسرت و یاس کے انجام سلگ اٹھے ہیں

فکر و احساس کی لو تیز کرو درویشؔ
زخمِ دل صورتِ الہام سلگ اٹھے ہیں

آپ کی خاموشیوں سے خوں اگل جائیں گے دن
بات رہ جائے گی دل میں اور نکل جائیں گے دن

رخ کی تابانی سے تیرے صبح روشن ہوگئی
تیرے دامن کی ہوا سے اور جل جائیں گے دن

رات بھر شبنم میں ڈھل کر ساری کلیاں کھل گئیں
آنسوؤں کو پی کے میرے کیا ! بدل جائیں گے دن

دشتِ وحشت سے نکل جائیں گے جب اہلِ جنوں
روئے گی شب کی سیاہی ہاتھ مل جائیں گے دن

پڑھ کے مکتوبِ سحر ہم قدرِ صبح نو کریں
طول ہوجائیں گے سایے جب کہ ڈھل جائیں گے دن

اپنا یہ ایقان ہے جہد و طلب کی راہ میں
ٹھوکریں کھاکر زمانے کی سنبھل جائیں گے دن

دامنِ شب اور اس کی اس قدر تابندگی
دیکھ کر اس حسنِ دلکش کو مچل جائیں گے دن

یہ ضروری تو نہیں ہے وسوسوں کی گود سے
عہدِ رفتہ کی طرح درویشؔ ٹل جائیں گے دن

یاد کو سنبل و سوسن کرلوں
ہجر کو حاصلِ گلشن کرلوں

حوصلہ پائے نظر کو دیدوں
وسعتِ دشت کو آنگن کرلوں

عقل صدیوں سے ہے حریف جنوں
فکر و احساس کو روشن کرلوں

برق مایوس ہو خدا نہ کرے
چل کے تعمیر نشیمن کرلوں

ہر تمنا کو آئینہ دے کر
چاہتا ہوں ترا درشن کرلوں

کچھ تو اندازۂ غم ہو درویشؔ
درد کو واقفِ دامن کرلوں

کسی کے روبرو آنے کی گنجائش بہت کم ہے
مقابل آئینہ لانے کی گنجائش بہت کم ہے

ستاروں نے دیا ہے نور شب کو اس تصور سے
سحر کے لوٹ کر آنے کی گنجائش بہت کم ہے

بدل ڈالا ہے میخواروں نے جب سے اپنے مشرب کو
صراحی اور پیمانے کی گنجائش بہت کم ہے

جنوں جب سے ہوا شامل مرے افسانۂ غم میں
سمجھنے اور سمجھانے کی گنجائش بہت کم ہے

تری یادوں کی آمد کا ہوا ہے سلسلہ جاری
شبِ فرقت میں نیند آنے کی گنجائش بہت کم ہے

بقدرِ ظرف دے ساقی نگاہِ مست کے ساغر
میرے پی کر بہک جانے کی گنجائش بہت کم ہے

سناؤں کیا تمہیں ٹوٹے ہوئے دل کے فسانے کو
شکستہ ساز پر گانے کی گنجائش بہت کم ہے

بخوبی علم ہے حالات کو میرے تحمل کا
حوادث پے بہ پے آنے کی گنجائش بہت کم ہے

جہاں انسانیت ہے لائق توقیر درویشی
وہاں کعبہ و بتخانے کی گنجائش بہت کم ہے

پیام شوق سوئے خلوت بتاں کہئے
حضورِ حسنِ محبت کی داستاں کہئے

نیاز و ناز کا اک امتزاج ہے جس کو
دو بیقرار دلوں کا مزاج داں کہئے

ہے اصطلاح زمانے میں جس کا نام بیاہ
نگارِ فطرتِ رنگیں کی ہم زباں کہئے

ہجوم جلوۂ حسن و شباب کا منظر
لب بہار کے نغموں کی ترجماں کہئے

فراق و ہجر کی مونس سکونِ دل کی ندیم
نویدِ عیش پیامِ نشاط جاں کہئے

گل وثمن سے نکل آئے خلوتِ دل میں
وہ رنگ و بو جسے ہمرنگ گلستاں کہئے

جو رات ہوگئی منسوب ان کے نام کے ساتھ
بہ احترام اسے زیب داستاں کہئے

جو شہر عشق میں رہتے ہیں اجنبی کی طرح
انہیں امین وفا میرِ کارواں کہئے

شکنتلا سے یہ پرکاش چندر کا رشتہ
اسے حیات کا اک ربط جاوداں کہئے

خدا کرے کہ مبارک ہو یہ سفر انکا
اسی کو منزلِ مقصود کا نشاں کہئے

کچھ اور مقصد عرضِ ہنر نہیں درویشؔ
اسے بہانۂ رعنائی بیاں کہئے

دل شکستہ ہوں دل جلا ہوں میں
تری محفل میں بھی رہا ہوں میں

آج بھی آندھیوں کے دامن میں
ایک جلتا ہوا دیا ہوں میں

غم دوراں ذرا توقف کر
اپنے دامن کو سی رہا ہوں میں

اہل کشتی کو مجھ پہ حیرت ہے
آدمی ہوں کہ ناخدا ہوں میں

ایک نغمہ ہے خامشی میری
جانے کس ساز کی صدا ہوں میں

آج بھی رہگذارِ ہستی میں
اک مسافر کا نقشِ پا ہوں میں

بیداریِ افکار پہ نازاں ہے خردمند
ارباب جنوں آج بھی زندہ ہے مگر چند

یہ دورِ ترقی ، یہ تمدن ، یہ سیاست
لیکن ابھی انساں کے ہے احساس کا در بند

ممکن ہے نکل جائے ستاروں سے بھی آگے
فطرت کسی تحدید کی ہوتی نہیں پابند

زلفوں کی گھنی چھاؤں یہ' وہ آپ کا چہرہ
یہ شام اودھ ہے وہ کوئی صبح سمرقند

اک ایک ادھیڑیں گے انہیں ہم جو لگے ہیں
تہذیب کے جامے میں روایات کے پیوند

سن کر مری زبان سے آداب زندگی
ناراض ہوگئے نئی تہذیب کے فرزند

چاہوں تو بدل سکتے ہیں حالات زمانہ
درویشؔ کے افکار و خیالات کی سوگند

خود کو آہنگِ حادثات نہ کر
پھر سے تفریق ذات پات نہ کر

ظلم کی پھر سے ابتدا کر کے
دن کو شرمندہ ہائے رات نہ کر

مرحلے جہد کے ہیں باقی ابھی
زندگی وقفِ خرافات نہ کر

غم نصیبوں کو حوصلہ دے کر
تنگ دامان التفات نہ کر

دل چٹخ جائے مثلِ آئینہ
اس طرح درد و غم کی بات نہ کرو

آ گہی دل کو میسر ہے نہ سودائے جنوں
اپنے ہاتھوں سے ہوئے خود ہی گرفتار سکوں

فکر کی وادیٔ پرنور میں رکھتا ہوں قدم
یہ تمنا ہے کہ ہو تابِ نظر اور فزوں

دے کے آہنگ اچھوتا پئے تزئین غزل
مسکراتے ہوئے اسلوب کی تخلیق کروں

دیکھ کر آج بھی اس شام کی یاد آتی ہے
آسمانوں کے افق زار پہ پھیلا ہوا خوں

کتنے پر کیف نظارے ہیں چمن میں رقصاں
جی میں آتا ہے کہ خود اپنی نظر کو چوموں

کون دنیا میں نہیں تجھ سے کرم کا طالب
کیا ستم ہے کہ ، میں وارفتۂ بیداد رہوں

مرے وجدان کی قیمت ہے یہی درویشی
مجھ کو جو بات بھی کہنی ہو سلیقہ سے کہوں

مسلسل جو ترے غم کے اجالوں میں بسر ہوتی
اک ایسی رات بھی آئے کاش بے شام وسحر ہوتی

سمجھ پاتے اگر اہل خرد دیوانگی اپنی
گریباں کی خبر ہوتی نہ دامن پر نظر ہوتی

دریچے ذہن و دل کے وا اگر ہوتے محبت میں
ہمارے دردِ دل کی آہ خود پیغامبر ہوتی

یہ دنیا کس قدر ہے ناشناس آدمی یارب
یہاں بے کس کی بربادی پہ کس کی آنکھ تر ہوتی

جو ساحل ہی سے کرتے ہیں کھڑے موجوں کا نظارہ
بھلا کیسے انہیں درویشؔ طوفاں کی خبر ہوتی

بیٹھے ہوئے شیوخ ابھی خانقاہ میں
ترمیم کررہے ہیں صغیرہ گناہ میں

ہم ڈھونڈنے چلے تھے خود اپنے وجود کو
منزل بھی ہو کے رہ گئی گم ، گردِ راہ میں

شاید کہ لے رہی یہ وفا دل سے انتقام
ہوتا ہے ایک کرب سا محسوس آہ میں

گو راستہ کٹھن تھا مگر اس کے باوجود
کس درجہ آگے بڑھ گئے ہم تیری چاہ میں

تخریب ہی نے ہم کو پیام بقا دیا
ورنہ حیات سود تھی اپنی نگاہ میں

اے چاند ایک شب کے لئے زحمتِ نظر
آ رنگ و نور پھر مرے داغ سیاہ میں

انگڑائی لے رہے ہیں کنائے لطیف سے
درویشؔ اک حسین غزل کی پناہ میں

گلوں کی دوستی آہستہ بولو
بہت مہنگی پڑی آہستہ بولو

میں قطرہ ہوں سمندر پی گیا ہوں
ابھی ہے تشنگی آہستہ بولو

گذر جائے سکون و عافیت سے
یہ کیسی زندگی آہستہ بولو

اجالے ظلمتوں میں کھو گئے ہیں
کہاں کی روشنی آہستہ بولو

غزل کی آبرو ہے اور ہم ہیں
عجب ہے دل لگی آہستہ بولو

کہاں کے ہم نفس کیسی بصیرت
کدھر ہے دلبری آہستہ بولو

ابھی ہے حضرت واعظ میں باقی
گنہہ کی چاشنی آہستہ بولو

میرے وجدان نے سب چھین لی ہے
شعور و آگہی آہستہ بولو

نفس کی آخری حد تک نہ پوچھو
مقامِ آدمی آہستہ بولو

ہے میرِ کارواں سے کارواں تک
مسلط رہزنی آہستہ بولو

پیام انقلاب عصرِ نو ہے
صدا درویش کی آہستہ بولو

ظلمت و نور میں ٹکراؤ بڑی مشکل ہے
آئینہ اور یہ الجھاؤ بڑی مشکل ہے

شدتِ غم کا کوئی تجھ سے مداوا نہ ہوا
زندگی یہ ترا برتاؤ بڑی مشکل ہے

ہم تو آغاز سفر ہی پہ ہیں نازاں لیکن
فاصلے اور یہ پھیلاؤ بڑی مشکل ہے

جذب و اخلاص و وفا ، خدمت ایثار و کرم
ان کا اس دور میں بکھراؤ بڑی مشکل ہے

تیرا پیکر ہے وہ آئینہ خانہ جس پر
طنز و دشنام کا پتھراؤ بڑی مشکل ہے

اب ضرورت ہے کرے تازہ جراحت کوئی
کتنا بے کیف ہے یہ گھاؤ بڑی مشکل ہے

وقت کی بات ہے بھرپور غزل درویشی
ورنہ وجدان کا ٹھہراؤ بڑی مشکل ہے

نہ جانے دل ڈھونڈتا ہے کس کو نظر ابھی تک تلاش میں ہے
وہ نغمۂ بے صدا ہوں جس کی اثر ابھی تک تلاش میں ہے

یہ بات کیا کم ہے چاند سورج فضا میں کرنیں لٹا رہے ہیں
مگر ضیائے یقیں کی خاطر سحر ابھی تک تلاش میں ہے

زمانہ بیتا اک عمر گذری مگر ابھی تک نہ ہاتھ آئی
اسی متاعِ خودی کی خاطر بشر ابھی تک تلاش میں ہے

نظر بچا کر گذر گئی ہے نہ جانے کیوں برق آشیاں سے
مجھے گماں ہو رہا ہے وہ فتنہ گر ابھی تک تلاش میں ہے

ہزار راہیں ہزار رہرو قدم قدم پر ملے ہیں لیکن
وہ کون گم گشتہ ہے کہ جس کی خضر ابھی تک تلاش میں ہے

وہ جس نے میری نظر کو آئینہ بنکے بخشا تھا عکس اپنا
وہ پرتو نور جس کی آئینہ گر ابھی تک تلاش میں ہے

کریں گے درویشؔ ہم بھی تزئین شعر رنگ و شعور بھر کر
سنا ہے دشت غزل میں اک دیدہ ور ابھی تک تلاش میں ہے

نظر کا سوز جگر کا گداز کاغذ پر
لکھا کریں گے یوں ہی دل کا راز کاغذ پر

اٹھا کے دیر و حرم کے ضمیر سے پردے
دکھا حقیقتِ صدق و مجاز کاغذ پر

سہو تلاش نہ کر سجدۂ سہو میں میرے
کبھی نہ لا میرا عجز و نیاز کاغذ پر

عجیب ہیں نئے آذر میرے زمانے کے
تراشتے ہیں بتانِ مجاز کاغذ پر

ہیں جتنے چاک رفوگر مگر گذارش ہے
حسابِ زخم نہ کر چارہ ساز کاغذ پر

کسی بھی سمت سے آئی نہ روشنی گھر میں
بہت سے گذرے ہیں بندہ نواز کاغذ پر

متاعِ شعر زمانے کو سونپ درویشی
نہ لا خلوص کا کوئی جواز کاغذ پر

میں اک احساس ہوں میرے جذبات لکھ
اے نقیبِ قلم میری ہر بات لکھ

قلب کو آگاہی کا لہو بخش کر
اس متاعِ گراں کی حکایات لکھ

غم بہرحال غم ہے کسی کا سہی
غم سے پہلے شعورِ غمِ ذات لکھ

خوں بہا مانگنے سے تو بہتر ہے یہ
دستِ قاتل کے زورِ کمالات لکھ

چاندنی بن کے آ شب کی آغوش میں
دھوپ میں دن کی ذکر ملاقات لکھ

ایک حرف صداقت ازل سے ہوں میں
اے فقیہ شہر میری اوقات لکھ

بے سبب آئینہ تو نہیں ٹوٹتا
آئینہ ٹوٹنے کی وجوہات لکھ

قد ہے بونوں کا لیکن ہیں باتیں بڑی
اس نئی نسل کے آ کمالات لکھ

سنگریزوں کی پہلے شکایات سن
آئینہ درمیاں رکھ غمِ ذات لکھ

تجربوں سے نہ آنکھیں چرا دہر میں
اپنے تہذیب کی سب روایات لکھ

پہلے میری نواؤں کو سن اور پھر
شوق سے خوشہ چینوں کے حالات لکھ

اے قلم کے نگہدار درویشؔ سن
پاک جو مصلحت سے ہو وہ بات لکھ

خودی ہے زندہ شب و روز گل کھلانے سے
ہمارا ظرف سلامت ہے مسکرانے سے

ہزار ضبط کیا پھر بھی آنکھ بھر آئی
کہ سوزِ غم بھی چھپا ہے کبھی چھپانے سے

صلیبیں لاکھ لٹکتی رہیں سروں پہ مگر
یہ اہلِ حق نہ رکیں گے قدم بڑھانے سے

جو مصرعے سرحدِ احساس چھو کے گذرے گا
وہ درد پائے گا غزل میں آنے سے

جلا کے بھول گئی برق مدتیں گذریں
شرار آج بھی اٹھتے ہیں آشیانے سے

خلوص بانٹنے والو عوام میں آؤ
حیات جھوم اٹھے گی تمہارے آنے سے

بساطِ فکر کا محور یقیں ہے درویشی
اب اور آرزو کوئی بہن زمانے سے

لب پہ کلیوں کے تبسم کا نکھار
عارضِ گل پر ہے شبنم اشکبار

شوخیِ بادِ نسیمِ صبح سے
غنچہ ہائے نو دمیدہ مشکبار

ڈال گردوں پر تجسس کی نظر
ذرہ ذرہ سے عیاں ہے حسنِ یار

پی گیا ہوں تلخیِ ایام کو
زندگی کے رخ پہ ہے جس کا خمار

بیچتے ہیں جو متاعِ دردِ دل
ہیں وہی سنگِ ملامت کا شکار

مرحبا دورِ تمدن کا فریب
دسترس میں جبر کی ہے اختیار

ہائے بیچاری سیاست جس کا نام
رکھ دیا ہم نے بدل کر اقتدار

خود پرستی نے اٹھایا جب سے سر
گھٹ گیا ہے آدمیت کا وقار

فکر و فن کی دولت بیدار سے
ہے ادب خود آج کا نا آشکار

جانے کب ہو شاخ حسرت بارآور
جانے کب آئے گلستاں میں بہار

حسن معنیٰ ہو نہ گر اشعار میں
پھول سا احساس بھی ہے نوک خار

مشعل جہد و عمل لیکر بڑھو
تیرگی کا دور ہوجائے غبار

چھیڑیئے تازہ کوئی رنگیں غزل
ہو فضائے صحنِ گلشن نغمہ بار

جانتا ہوں رازِ تقدیر حیات
کس کو درویشیؔ ہو فکر روزگار

کس کٹھن امتحان سے نکلے
دل کے کانٹے زبان سے نکلے

دشمنوں کے خلوص پیہم میں
دوست بھی مہربان سے نکلے

دل نوازی شعار تھا جن کا
وہ بھی اب بدگمان سے نکلے

پڑگئی ایسے وہ نظر دل پر
تیر جیسے کمان سے نکلے

بحر غیرت میں چاند ڈوب گیا
جب وہ اپنے مکان سے نکلے

جب حقیقت کھلی تو کانٹے بھی
پھول کے خاندان سے نکلے

آئی جب بات لب پہ پیری کی
سارے ارماں جوان سے نکلے

موت سے پیار کرنے دیوانے
بے نیازانہ شان سے نکلے

شکر ہے ہم یقیں کے سائے میں
حلقہ ہائے گمان سے نکلے

زندگی کے سفر میں درویشؔ
ہم بڑے سخت جان سے نکلے

ترے خیال کی عظمت دلوں میں ملتی ہے
جمال صبح کی رنگت گلوں میں ملتی ہے

خلوص بچ گیا الزام بے وفائی سے
وفا وگر نہ کہاں دوستوں میں ملتی ہے

ہے جس کے دم سے گلستاں کا بانکپن قائم
وہ خوئے خندہ بلبی جو گلوں میں ملتی ہے

نوائے درد کی بے چارگی پہ طنز نہ کر
ہم اہل غم کے شکستہ دلوں میں ملتی ہے

دیا گیا ہے جسے آبروئے زیست کا نام
بہ فیض گرمئی دل ، حیرتوں میں ملتی ہے

اب اٹھ کے کیوں نہ حوادث کا رخ بدل ڈالیں
مگر یہ طرز جنوں حوصلوں میں ملتی ہے

جواز ڈھونڈ نکالا ہے خیر و شر کا مگر
جو اصلیت ہے تری صحبتوں میں ملتی ہے

وجود جس کا نہیں مشتِ خاک سے بڑھ کر
وہ آج دیکھئے کن رفعتوں میں ملتی ہے

شفق نہائے سرِ شام تیری انگڑائی
ملیح صبح کی تجلیوں میں ملتی ہے

تمام عمر کٹی سادگی میں درویشی
یہ جابرانہ صفت کب سبھوں کو ملتی ہے

شبنم سے موتیوں کا جو رشتہ ہے سن ذرا
قدرت کا ایک ادنیٰ کرشمہ ہے سن ذرا

کہتے ہیں جس کو موت عجب شئے نہیں کوئی
اک عرصہ حیات کا وقفہ ہے سن ذرا

تازہ ہے دل میں ماں کی جدائی کا غم ہنوز
فطرت کا ایک یہ بھی تقاضہ ہے سن ذرا

گو لاکھ خوف مجھ کو دلائے مرا ضمیر
اس کے کرم پہ مجھ کو بھروسہ ہے سن ذرا

تفسیر میرے عہد کی اب کیا کرے کوئی
ہر خود شناس غرض کا بندہ ہے سن ذرا

پہچان کھو چکا ہو جہاں اپنی آدمی
وہ زندگی فریب ہے دھوکا ہے سن ذرا

سجدہ کیا تھا جس کو فرشتوں نے اے زمیں
آدم کہ آسماں کا نوشتہ ہے سن ذرا

تاریکیوں میں شمع جلانا ہے میرا کام
شاعر ہوں میرا امن سے رشتہ ہے سن ذرا

سودا کیا نہ اپنی خودی کا تمام عمر
درویش اسی کے فیض سے زندہ ہے سن ذرا

مری تلخیوں نے بڑھ کر جو مجھے دیا سہارا
غمِ زندگی بھی آخر مجھے ہوگیا گوارا

مرا پائے عزم و ہمت جو رہِ یقیں سے بھٹکا
تجھے ہر قدم پہ میں نے بڑے ناز سے پکارا

مری چشم تر سے آنسو جو مژہ پہ لڑکھڑایا
تری شوخیٔ نظر سے وہیں بن گیا ستارہ

کسی راہبر کے احساں میں اٹھا سکونگا کیوں کر
کوئی حسرتوں سے کہدو کہ وہ بڑھ کے دیں سہارا

ابھی فضا پہ مسلط ہے شب کی پہنائی
ابھی کہاں ہے دلوں میں وہ ذوق برنائی

ابھی حیات نے کب لی ہے شوخ انگرائی
نہیں نہیں وہ ابھی شبھ گھڑی نہیں آئی

سحر سحر نہ پکارو کے رات باقی ہے
راہیں پر پیچ تو بہکے ہوئے چلنے والے

فکر و احساس پہ مدت سے پڑے ہیں تالے
جاگ اٹھے ہیں ہر اک گام پہ فتنے کالے

اب تو بیدار ہو للہ ! قافلے والے
بساطِ دل پہ غم کائنات باقی ہے

کلی کا حسن ہوئے پھول کا شباب ہوئے
وہ جلوے جو تری نظروں سے فیضیاب ہوئے

جس انجمن میں تمنا تھی باریابی کی
مقامِ شکر کہ ہم آج باریاب ہوئے

حجاب بن کے جو دِل میں تھے ایک مدت سے
وہ چشم شوق میں یوں آج بے حجاب ہوئے

عجب تھی اُن کی نگاہ بزم میں اُٹھ کر
کبھی سوال بنے آپ ہی جواب ہوئے

نظمیں

میرے عزیز وطن

تجھے زمانے میں ہم شہریار کرتے ہیں
عمل کے حسن سے پیدا نکھار کرتے ہیں
دراز سلسلۂ نور بہار کرتے ہیں
حیات نو سے تجھے ہمکنار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

چمن حیات کے پھولوں سے پھر سجادینگے
نئے اجالوں سے دھرتی کو جگمگادینگے
ہم اپنے دیش کو خود مکتفی بنادینگے
کچھ اس ادا سے تجھے لالہ زار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

بھلائی میں تری عظمت کی ترجمانی ہے
یہ ہیراکٹ جو ترے عزم کی نشانی ہے
ترے ہی خون سے ساگر میں اِک روانی ہے
ترقیات کو یوں اُستوار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

تری زمین ہے علم و ادب کا گہوارہ
تری زمین پہ بہتا ہے امن کا دھارا
تری زمین پہ فردوس کا ہے نظارہ
جہاں میں یوں ترا افزوں وقار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

دلوں میں مشعل عزم و یقیں جلائے ہوئے
ہر ایک خاک کے ذرے کو جگمگائے ہوئے
وطن کا نام لبوں پر ، قدم بڑھائے ہوئے
کچھ اس ادا سے دل و جاں نثار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

نہیں یہ وقت حسینوں کی جستجو کے لئے
نہیں یہ وقت نہیں شرحِ رنگ و بو کے لئے
یہ وقت ہے تو فقط حفظِ آبرو کے لئے
وفا کا ذکر جو ہم بار بار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

تری بقا میں ہے پوشیدہ زندگی اپنی
ترا وجود ہے گویا سلامتی اپنی
ترے وقار سے وابستہ ہے خوشی اپنی
یہ فرض تیرے لئے اختیار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

چمک اٹھی ہے ہر اک دل میں روشنی کی کرن
نہ آنے پائیگی ماتھے پہ نوجواں کے شکن
کبھی رکیں گے نہ بہتے ہوئے یہ گنگ و جمن
یہ عزم تجھ سے تیرے غمگسار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

تری بقا کے طلب گار بن گئے ہیں ہم
خود اپنی ناؤ کی پتوار بن گئے ہیں ہم
عدو کی راہ میں دیوار بن گئے ہیں ہم
یہ عہد اور یہ قول و قرار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

سرورِ جان نثاری کا احترام بھی ہے
وہ سرفروش عزائم کا اہتمام بھی ہے
جلو میں جرأت عبدالحمید عام بھی ہے
بڑے خلوص سے یہ کاروبار کرتے ہیں
سن اے عزیز وطن تجھ سے پیار کرتے ہیں

نہرو

اداس ہے دلِ گیتی عجیب عالم ہے
کہ شرق و غرب میں اک تیری موت کا غم ہے

اگرچہ چھین لیا وقت نے تجھے لیکن
جہاں میں تیرے اصولوں کا خیر مقدم ہے

بھری بہار میں ایسا لٹا چمن کا سہاگ
یہ دیکھتا ہوں کہ نرگس کی آنکھ بھی نم ہے

یہ کیا ستم ہے اٹھا حسرتوں کا دل سے دھواں
یہ کیا غضب ہے کہ زلفِ حیات برہم ہے

خلوص و امن کا داعی فراق میں جسکے
چراغِ رونقِ بزم سکوں مدھم ہے

کریں گے عشق اب آگے تیرے اصولوں سے
یہ عزمِ شوق تیرے عاشقوں کا کیا کم ہے

کچھ اور روز وطن کو تیری ضرورت تھی
جو تو نہیں ہے اسی ایک بات کا غم ہے

مورخین اٹھائیں گے جب قلم درویشؔ
یہی لکھیں گے جواہر تو فخرِ عالم ہے

تیگور

ذرے ذرے سے خورشید ڈھالا تو نے بھارت کو بخشا اجالا
تو نے پوجا ہے انسانیت کو زندگی کا بناکر شوالا

کھل گئیں عظمتیں زندگی کی تو نے اسلوب ایسا نکالا
ایسی فکر و نظر دی ادب کو ہوگئی جس سے رونق دوبالا

تو نے ڈوبے ہوؤں کو اُبھارا تو نے گرتے ہوؤں کو سنبھالا
قوم کو پھر ضرورت ہے تیری ارضِ بھارت کو حاجت ہے تیری

دور ایسا بھی گذرا ہے ہم پر ہم تھے محبوس مجبور و مضطر
ہم ہوئے بھی تو آزاد ایسے جبر سے ظلم سے دور رہ کر

تیرا وہ قول ہے یاد ہم کو خود بنائیں گے اپنا مقدر
بڑھتے جاتے ہیں اب سوئے منزل خود ہی رہرو ہیں ہم خود ہی رہبر

قوم کو پھر ضرورت ہے تیری ارضِ بھارت کو حاجت ہے تیری
تیرے پیغام سے دیش ہمارا عالمی امن کا ہے ستارہ

تیری فکر و نظر کی بدولت عقل و حکمت کا بہتا ہے دھارا
خدمتیں بے غرض تھیں تری سب سارے عالم پہ ہے آشکارا

تیری خواہش ہمیشہ یہی تھی ساری قوموں کا ہو بھائی چارا
ہو محبت سے لبریز دنیا یہ جہاں ایک کنبہ ہو سارا

درحقیقت اے ٹیگور تھا تو امن کا عافیت کا ستارا
زیست یوں تو بڑی مختصر ہے تو امر تیرا پیغام امر ہے

اک ایسا انقلاب اے چشم دوراں چاہتا ہوں میں

چراغ علم و دانش کو فروزاں چاہتا ہوں میں
جوانوں میں عمل کا ذوقِ پنہاں چاہتا ہوں میں
خلوص باہمی میں سینے میں رقصاں چاہتا ہوں میں
یہی اہل وطن سے عہد و پیماں چاہتا ہوں میں

دلوں سے لغزش شبہات سارے دور ہوجائیں
عناد و بغض کے لبریز ساغر چور ہوجائیں
جو آپس میں ہیں باقی تفرقے کا فور ہوجائیں
طبیبِ امن سے ان سب کا درماں چاہتا ہوں میں

غموں کو بانٹ کر آپس میں ہر ایک کو خوشی دیکر
فسردہ زندگی کو اعتبارِ زندگی دیکر
شبِ تاریک کو اک بار پھر سے روشنی دیکر
بہر صورت تغیر زیب داماں چاہتا ہوں میں

دلوں میں احترام آدمیت کی ضرورت ہے
اخوت کی ضرورت ہے محبت کی ضرورت ہے
خیال و فکر میں بے پایاں وسعت کی ضرورت ہے
حیاتِ نو نئی لئے میں غزلخواں چاہتا ہوں میں

ہر اک ذرہ میں ہو حسن عمل کی کارفرمائی
چمن والوں میں پیدا ہو خدارا ذوقِ رعنائی
وہ دن آئے کہ شیخ و برہمن میں پھر ہو یکجائی
اسی کا عکس ہر دل میں نمایاں چاہتا ہوں میں

مرے ارضِ وطن کی مانگ میں تارے دمک اٹھیں
شمیم مشکبوے وقت کے گیسو مہک اٹھیں
فضا میں ارتقاء کے زمزمے ہر سو کھنک اٹھیں
اک ایسا انقلاب اے چشم دوراں چاہتا ہوں میں

شراب کی تباہی

کرے سوال کوئی مجھ سے گر براہِ خلوص
بتایئے کسے کہتے ہیں زندگی کا عذاب

میں برملا یہ کہونگا وہ دشمن ہستی
ہے اصطلاح زمانہ میں جس کا نام شراب

ازل سے جب کبھی قوموں میں انحطاط آیا
تباہیوں میں برابر رہی ہے یہ شامل

شراب جس نے دیا ہے خباثتوں کو جنم
گواہ اس پہ ہیں ماضی و حال و مستقبل

شراب جس کے ہیں محنت کش و غریب شکار
ہے اہل زر کو بھی اس سے مفر نہیں ممکن

ہمارے دور میں تہذیب کی علامت ہے
بغیر اس کے کسی کا گذر نہیں ممکن

بدل چکی ہیں اگرچہ حیات کی قدریں
زمانہ ذوقِ عمل سے بہت گریزاں ہے

یہی وہ غارتِ ایمان ہے کہ جس کے طفیل
اک انتشار ہے برپا ، سکوں پریشان ہے

ادھورے رہ گئے سب خواب ہائے مستقبل
نئے سماج کی تشکیل کا سوال گیا

وہ انقلاب ، ضرورت تھی ملک کو جس کی
اسے پیالہ و ساغر میں ہم نے ڈھال لیا

دبے ہیں قرض تلے جتنے قوم کے افراد
وہ چاہتے ہیں گر اس بوجھ سے نجات ملے

علاج قوم کی پسماندگی کا بس یہ ہے
شراب جس کا کوئی بھول کر بھی نام نہ لے

شراب جس نے کیئے کتنے خاندان تباہ
نہ جانے کتنے بھرے گھر اجاڑ ڈالے ہیں

شراب ! کشتۂ تہذیب کا وہ معدن ہے
خباثتوں نے جہاں اپنے پر نکالے ہیں

نہ جس کو ہوش ہو اپنا نہ بیوی بچوں کا
وہ آدمی ہے مگر کونسی خرابی ہے
کیا شراب کی لعنت نے اس قدر رسوا
جو دیکھ لے اسے کہدے کہ یہ شرابی ہے

رفاہِ عام کی خاطر یہ اب ضروری ہے
فلاح و امن کی قدروں کا احترام کریں

بنا کے ملک میں قانون نشہ بندی کا
نئی حیات ، نئی سرخوشی کو عام کریں

گمنام درخواست

(بہروپیئے)

شہر میں ہے چار سو اک بدگمانی کا چلن
کیا عجب ہے فاقہ مستوں کا ہو یہ دیوانہ پن

مقصد اس کا کچھ سہی ہم تو سمجھتے ہیں کہ یہ
اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگا بجز بٹھیار پن

بے سبب نفرت، عداوت، بغض، کینہ و حسد
اور سینوں میں نظر آئے گی غیبت موجزن

خانقاہوں کے مجاور اپنا پیشہ چھوڑ کر
مسجدوں میں بنے بیٹھے امام فکر و فن

یہ ریاکاری کی جیتی جاگتی تصویر ہیں
اب بھی ان بہروپیوں کی ہے وہی طرزِ کہن

ہاتھ میں تسبیح رواں ہے لب پہ ذکر لا الٰہ
دیدنی ہے ان کے زہد و اتّقا کا بانکپن

اس سے بڑھ کر اور کیا ہوگی رکاکت کی مثال
افترا پرداز مفسد حاملِ ایماں شکن

قومی یکجہتی سے خائف بدگماں ہر ایک سے
فکر ہوتی ہے فضا باقی رہے نہ پر امن

دیکھ پاتے ہیں جب آپس میں خلوص و اتحاد
باندھ کر سر سے نکلتے ہیں عداوت کا کفن

تہمت بیجا لگانے میں نہیں ان کا جواب
خوب آتا ہے انہیں فطرت سے غداری کا فن

الاماں فردوس میں حوروں کے پانے کا یقیں
دل ریاکاری کا محزن فکر کا یہ حسنِ زن

کیا کہیں یہ رہنما ہی قوم کے جلاد ہیں
سچ اگر پوچھو تو یہ بوجہل کی اولاد ہیں

کون ہیں ہم آؤ بتلائیں تمہیں اہل وطن
باب میں انسانیت کے ہم ہیں اربابِ سخن

بانٹنا ہے کام اخلاص و محبت دہر میں
قوم کو دیتے ہیں فکر نو کا رنگیں پیرہن

ہم امانت ہیں جہاں میں آنے والے دور کی
ہم سے وابستہ ہے دنیا میں محبت کا چلن

ہم میں احساسِ مروت امن کے پیغامبر
دھڑکنوں میں دل کے رہتی ہے اخوت موجزن

ہم نے تہذیبوں کے رشتوں کو کیا ہے استوار
امن و یکجہتی کی دی ترتیب ہم نے انجمن

سربکف ہوکر نکلتے ہیں برائے انقلاب
امن کے ماتھے پہ جب بھی دیکھ لیتے ہیں شکن

چھیڑتے ہیں لے میں سازِ نو کی جب نغمہ کوئی
تیز ہوجاتی ہے جس کے سحر سے نبض کہن

ہم کو پہچانو! ہم اپنے وقت کے شہکار ہیں
داعی امن و اماں ہیں قوم کے معمار ہیں

خودکشی

زمیں پہ لوگو رسول آئے
کتاب اتری
کتاب میں جو لکھا ہوا ہے
ہمارے آبا وہ پڑھ چکے ہیں
جو روز و شب ہم بھی پڑھ رہے ہیں
کوئی جو پوچھے اگر یہ ہم سے
خدا ہے کون
اختیار کیا ہے
وہ نور کیا ہے جو آسمانوں سے اس زمیں تک چھلک رہا ہے
ہے آخرت کیا
شعور کیا ہے
نظام فطرت کہیں گے کس کو
سزا جزا کا اصول کیا ہے
جواب کب بن پڑیگا ہم سے کہ ہم ہیں پیدائشی مسلمان
اس اندھی تقلید سے تو بہتر تھا خودکشی کا جواز ہوتا

قطعات

✿

صبح آفات کے شعلوں میں جلی جاتی ہے
شام ظلمات کے پردوں میں چلی جاتی ہے
اپنے معبود کی تقدیس کو پانے کے لئے
زندگی موت کے سایہ میں پلی جاتی ہے

نظر ملا کے مرے ساقی نے سلام کیا
بڑے خلوص سے خنجر کو بے نیام کیا
تڑپ تڑپ کے مرے دل نے انکی محفل میں
مسرتوں سے بھرا رقصِ ناتمام کیا

ہجوم یاس میں وارفتگیٔ دل مت پوچھ
ہزار صبح کیا اور ہزار شام کیا
چٹک کے غنچے چمن میں سحر سے پہلے ہی
عجیب طرح سے ہنسنے کا اہتمام کیا

شاخ سے ہوتا ہے جیسے ہی جدا
خاک ہوجاتی ہے رعنائی گل
کام ہو جس کا حقائق سے گریز
''سامراجیت'' فتورِ عقل کل

درد غم سوز اضطراب و خلش
چند عنواں ہیں زندگانی کے
گر سلامت ہو عزمِ پائے ثبات
کیوں پھریں دن نہ عمر فانی کے

تجربہ ہے کہ روٹھ جانے سے
دوستی کا زیاں نہیں ہوتا
دوست وہ ہے جو دوستی میں کبھی
فطرتاً بدگماں نہیں ہوتا

دیکھ کر سوئے فلک یوں کبھی آتا ہے خیال
کتنا رخشندہ قمر ! کتنے حسیں تارے ہیں
آخر اس حسن کی تخلیق کا منشاء کیا ہے
کون ہے صاحبِ فن ! کس کے یہ شہ پارے ہیں

اکثر اوقات میں یہ سوچ کے چپ رہتا ہوں
بربطِ دل میں یہ نغموں کا تلاطم کیسا
میرے افکار کی اس وسعت بے پایاں میں
لفظ و معنیٰ کا ہم آہنگ ترنم کیسا

میری اس بات پہ مشکل سے یقیں آئے گا
میں بھی فنکار ہوں ماحول کی پھولواری کا
عکس ڈھلتا ہے جو حالات کا سینے میں مرے
حاشیہ اس پہ چڑھا دیتا ہوں بیداری کا

سرمایۂ فن فکر کا خمیازہ ہے
یہ اہل نظر کا غلط اندازہ ہے
اخلاص سے بھر پور دل شاعر میں
کچھ آج بھی ایمان سخن تازہ ہے

یہ رسم نظر بازی وہ آوارہ دلی
افسوس کہ اب عام ہوئی کم نفسی
تخئیل میں وہ جرأت پرواز کہاں
جو فن کو عطا کرتی ہے صاحب نظری

کھاتے رہے تازیست فریبِ مہ و سال
امروز کی فکر کی نہ فردا کا خیال
غفلت سے ہوئے نہ جانے ابتک کتنے
منصوبے ناکام ارادے پامال

حسن اور عشق میں ازل ہی سے
منسلک ایک ہی کہانی میں
ہے وہی ربط غنچہ و گل میں
جو میرے دل تری جوانی میں

آپ کا سرمئی تکلم بھی
کس قدر دلنواز ہوتا ہے
منحصر جیسے نغمہ و لئے پر
ربط آہنگِ ساز ہوتا ہے

شمع اخلاص کی ہر دل میں فروزاں کردو
حسن یکجہتی کا ہر رخ پہ نمایاں کردو
آؤ اے ہم سخنو ، پیار کی لئے تیز کرو
بزم کو اپنی نواؤں سے غزل خواں کردو

گیان کی روشنی وگیان کی تنویر کہو
ارض بھارت پہ اسے امن کی تصویر کہو
ہم سے کیا آندھرا پردیش کا ہو وصف بیاں
قوم کے ایک حسیں خواب کی تعمیر کہو

رقص کرتے ہوئے پروانوں کا اندازِ جنوں
مری بیتاب نگاہوں نے یہ کیا دیکھا ہے
درحقیقت میرے احساس گراں مایہ نے
حسن کو مائلِ تجدیدِ وفا دیکھا ہے

دھندلکے شب کے رخصت ہو رہے ہیں
سحر ہونے میں ہے کچھ دیر باقی
طلوعِ شب سے ہوں محرومِ بادہ
یہ کیا اندھیر ہے اندھر ساقی

حق وہ ناکارہ ہے باطل جو گوارہ کرلے
موت ہے موج کی ساحل جو گوارہ کرلے
آب و آتش کا یہ رشتہ کبھی ممکن ہی نہیں
بے یقینی کو اگر دل جو گوارہ کرلے

دیدۂ نم کو جام جم سمجھا
جو بھی سمجھا بہت ہی کم سمجھا
اس سے بڑھ کر نہیں متاعِ عزیز
جس نے اوروں کے غم کو غم سمجھا

زبان تک شکوۂ بیداد آیا
نہ جانے دِل کو کیا کیا یاد آیا
بھلا بیٹھے تھے ہم جور و جفا کو
وفا کا عہد ناحق یاد آیا

نکہت و نور کی رنگیں قبا دیتا ہے
شمع احساس کی لو اور بڑھادیتا ہے
کون ہے وہ ! جو پس پردۂ ادراک وشعور
میرے افکار کو تابندہ بنادیتا ہے

جب بھی تیرا خیال آتا ہے
غم کو آسودہ حال پاتا ہوں
تجھ کو پاکر بصد نیاز اپنی
احتراماً جبیں جھکاتا ہوں

شمعِ دل بے سوز پگھل سکتی ہے
فطرت کی نوا روح میں ڈھل سکتی ہے
احساس اگر شعلہ صفت ہوجائے
اک طرز سخن نئی نکل سکتی ہے

پھیلائے ہوئے قوم ہے دامانِ سوال
ہر چہرے پہ آتی ہے نظر گردِ ملال
حالات تو درویش یہ دیتے ہیں پتہ
اب دیکھئے کچھ دیر میں آیا ہے زوال

ذروں کو جلا دے کے گہر کرنا ہے
ماحول کو فردوسِ نظر کرنا ہے
ظلمات کا یہ دور مسلسل کب تک
بیدار ہو ، تدبیر سحر کرنا ہے

جمہور کا یہ دور یہ حالاتِ زبوں
آزاد ہر برائی ہوس ہے افزوں
جو ترکۂ ارباب وفا تھا پہلے
ہاتھوں میں ہے وہ آج خرد کے مفتوں

اظہار تشکر

- جناب ابوالمکارم غازی الدین کمال کریم نگری (کریم نگر)
- جناب سردار سلیم (حیدرآباد)
- جناب اسد ثنائی (حیدرآباد)
- جناب حمایت علی خان (کورٹلہ)
- جناب جواد خان (کھمم)
- جناب محمد یوسف (حیدرآباد)
- جناب شیخ احمد شیخ (کھمم)
- جناب سکندر محسن (کھمم)
- جناب سید عباس (کھمم)
- جناب شجاعت علی خان (حیدرآباد)
- جناب محمد رفیع الدین (کورٹلہ)
- جناب محمد عبدالواسع (حیدرآباد)
- جناب سلام خوشنویس (حیدرآباد)
- جناب حافظ محمد معزالدین مکرم (حیدرآباد)
- جناب محمد ذکی الدین لیاقت (حیدرآباد)

تمت

خواجہ معین الدین خان درویشی کورٹلوی
کے مجموعہ کلام کی اشاعت کے موقع پر

نیک تمناؤں کے ساتھ

VIJAYA

MILK & MILK PRODUCTS

Simply The Best

ANDHRA PRADESH DAIRY DEVELOPMENT CO-OPERATIVE FEDERATION LTD.

Lalapet, Hyderabad, Ph : 040-27019851 website : www.apdairy.com

جنوبی ہند کی ادبی آب و ہوا شروع سے خوشگوار ہے۔ بنیادی طور پر شاہی سرپرستی جیسے بہمنی، قطب شاہی، عادل شاہی اور آصف جاہی سلاطین کی ادب پروری نے اُردو ادب کو خوب پروان چڑھایا، یہاں کے سلاطین خود باکمال شاعر و انشاپرداز ہوا کرتے تھے، یہی سبب ہے کہ دکن اور دکن کے قرب و جوار کی سنگلاخ زمینوں میں تک شعر و شاعری کے ہرے بھرے نخلستان نظر آتے ہیں۔ ولیؔ، نشاطیؔ، وجہیؔ، نظامیؔ، سراجؔ، صفیؔ، وجدؔ، مخدومؔ، جامیؔ، شاہؔ ایسے نہ جانے کتنے نام ہیں، جنہیں تاریخ فخر سے یاد کرتی ہے، اور ایسے بھی کئی نام ہیں جن کی ابھی دریافت نامکمل ہے۔ کہنے والوں نے حیدرآباد کو صلاحیتوں کا قبرستان بھی کہا ہے لیکن کھوجنے والوں نے اسی سرزمین سے ان گنت قیمتی جواہر برآمد کیے ہیں اور ان کے فکر و فن کی روشنی کو دور دور تک پھیلایا ہے۔ ایسے ہی چند روشن جواہرات میں ایک گوہر آبدار بھی ہے جس کا نام مولوی خواجہ معین الدین خان درویش کورٹلوی مرحوم ہے۔ یوں تو درویش کورٹلوی کا تعلق ضلع کریم نگر سے ہے مگر ضلع کھمم، ورنگل، نلگنڈہ، وجئے واڑہ، حیدرآباد، اورنگ آباد، کڈپہ، کرنول جیسے دور دراز علاقوں میں جہاں کئی ایک ایسے اضلاع بھی ہیں جن میں اُردو کا نام و نشان تک نہ تھا باوجود اس کے درویش کورٹلوی کا کلام نشر ہوا کرتا تھا۔ اور ان کی پہچان تھی۔

اُن کی شاعری کا تعلق ادب کے اعلیٰ اقدار سے ہے، جس میں کسی بندھے ٹکے رجحان کی اثر پذیری کا شائبہ تک نظر نہیں آتا، درویش کورٹلوی کے اشعار سادہ اور سلیس زبان میں، سادگی میں پرکاری کی نظیر دکھائی دیتے ہیں۔ انہوں نے اپنے تخلیقی اظہار کی ترسیل کے لیے پر پیچ لفظیات کا سہارا نہیں لیا بلکہ نرم، مدھم اور ملائم اسلوب سے کام لیا ہے۔ ان کی شاعری پڑھتے ہوئے ٹھنڈی ہوا کی خوش خرامی اور گہری ندی کے خاموش تلاطم کا احساس ہوتا ہے، کلاسکی لہجہ و اسلوب کی حامل "لذتِ سوزِ جگر" کی یہ شاعری بڑی حد تک پُر اثر ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ اہل نظر میرے مطالعے میں شریک ہو کر اس کا حظ اٹھائیں۔

اسد ثنائی

مدیر الانصار، حیدرآباد